پیکر محرومی

(خود نوشت سوانح حیات)



ذاکر اہلبیت

ڈاکٹر سید انور حسین کاظمی مرحوم

مرتبہ:-

الحاج پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین کاظمی

خودنوشت

سوانح حیات

سیّد انور حسین کاظمی

(ابنِ)

سیّد محمد حسین صاحب
آنریری مجسٹریٹ و آنریری اسسٹنٹ کلکٹر
(سلون آئمہ)
ضلع رائے بریلی، صوبہ اودھ (یوپی) بھارت

سال اشاعت .... (۱۹۹۶ء)

مرتبہ .... "الحاج پروفیسر ڈاکٹر سید منظر حسین کاظمی"

کتابت ...... "سید محمد حسن عسکری زیدی ناظم ایرانایانی"

ہدیہ ..... سورۂ فاتحہ برائے ایصالِ ثواب،

۱۔ سید انور حسین کاظمی مرحوم ابن

سید محمد حسن مرحوم

۲۔ سیدہ صغیر بانو مرحومہ

بنت سید کوزیر حسین مرحوم

مندرجات

نمبر شمار	عنوان	صفحات
الف	ماموں جان .... (منتظر عباس نقوی)	I
۱-	انور بھائی مرحوم (الحاج پروفیسر ڈاکٹر سید مظفر حسین ہاشمی)	الف
۲-	ابتدائیہ اور خاندانی وجاہت (سید انور حسین مرحوم)	۱
۳-	ابتدائی تعلیم، ہاکی اور شکار کا شوق۔ 〃 〃	۵
۴-	محرم کی لڑائی .... 〃 〃	۲۲
۵-	امور زمینداری .... 〃 〃	۲۵
۶-	گھوڑے کی سواری .... 〃 〃	۳۱
۷-	پہلوانی کا شوق .... 〃 〃	۳۳
۸-	مقدمہ نور پور شاہ .... 〃 〃	۳۴
۹-	ذاکری کا شوق .... 〃 〃	۳۹
۱۰-	ڈاکٹری کا سلسلہ .... 〃 〃	۴۲
۱۱-	ازدواجی زندگی اور ڈرامائی شادی۔ 〃 〃	۴۳
۱۲-	زیارات ایران، عراق اور شام .. 〃 〃	۵۱
۱۳-	واقعات ہجرت ہندوستان برائے پاکستان 〃 〃	۵۲
۱۴-	ملازمت میں دفتری کارنامے .... 〃 〃	۵۳

نمبر شمار	عنوان			صفحات
۱۵-	اعلیٰ تعلیم کا شوق ..... (سید انور حسین مرحوم)			۶۳
۱۶-	آفاتِ زمانہ	"	"	۶۵
۱۷-	بسلسلۂ زمینداری ...	"	"	"
۱۸-	ازدواجی زندگی	"	"	۶۹
۱۹-	ستترالی میراث	"	"	۷۳
۲۰-	حکومتِ پاکستان کے مظالم	"	"	۷[illegible]
۲۱-	مکان کے لئے مسٹر ہاشم کی بے ایمانی	"	"	۸۵
۲۲-	صبر	"	"	۸۹
۲۳-	خاندانی و غیر خاندانی تعلقات .	"	"	۹۰
۲۴-	رفیقۂ حیات کا انتقال	"	"	۹۳
۲۵-	آخری لمحات، عزیزوں کی توجہ اور عدم توجہ -		"	۹۷
۲۶-	آخری تمنا		"	۹۹

I

ماموں جان

اگر آپ نے یہ کتاب اٹھا ہی لی ہے۔ اور ان سطروں کو پڑھنا ہی شروع کر دیا ہے تو پھر تھوڑی سی زحمت اور کیجیے کہ اسے آخر تک پڑھ ڈالیے۔ اسلئے نہیں کہ یہ کوئی بہت دلچسپ کہانی ہے، نہ اسلئے کہ اس میں حیران کُن غیر معمولی واقعات درج ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ایک عام آدمی کی سوانح حیات ہے۔ جس نے صاف سیدھے اور سچے جملوں میں اپنی آپ بیتی بیان کر دی ہے۔ اسے پڑھ کر آپ انور حسین کاظمی کے حالاتِ زندگی سے واقف ہو جائیں گے۔ اور اگر واقفیت یہیں تک رہی تو یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہوگا محض تضیعِ اوقات۔ اسلئے کہ یہ تو شمارِ شب و روز ہے اور ویسا ہی شمار جو کسی بھی عام انسان کی زندگی میں ہوتا ہے۔ ہاں اگر آپ کے پاس اتنی فرصت ہے کہ آپ ان حالات سے بڑھ کر صاحبِ حالات سے بھی متعارف ہو گئے تو پھر یقیناً آپ کو افسوس نہیں ہوگا۔ اسلئے کہ پھر آپ ایک ایسی شخصیت سے ملیں گے۔ جو زندگی گزارنے کا فن بتائے گا جو بتائے گا کہ معمولی حالات میں غیر معمولی پن کیسے پیدا ہوتا ہے۔ جو بتائے گا کہ خشک بنجر زندگی کو خوشگوار کیسے بنایا جاتا ہے۔ جو بتائے گا کہ مایوسیوں کے ہجوم میں اُمید کے چراغ کیسے روشن ہوتے ہیں۔ پھر آپ کو یہ کہانی ایک ایسے مہم جو سپاہی کی داستان نظر آئے گی۔ جس کے محاذِ حیات کے ہر موڑ پہ

دشمنِ زمانہ حملہ آور ہوتا رہا۔ انکو پسپا کرتا رہا۔ دھکیلتا رہا، شکست دیتا رہا، لیکن وقت کی کوئی چال ان کے ذہن کو پسپا نہ کر سکی۔ کوئی ناکامی انہیں شکست خوردگی پیدا نہ کر سکی۔ مایوسی کا بڑے سے بڑا جھونکا ان کے فانوسِ قلب و نظر میں دائمی روشن چراغِ امید کو گُل نہ کر سکا۔ اگر شکست و فتح کا تعلق واقعات سے نہیں بلکہ سپاہی کے احساس سے ہے تو انور حسین کاظمی دُنیا کے بڑے بڑے فاتحین کے سامنے خم ٹھونک کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہہ سکتے ہیں کہ کوئی مجھے شکست دے تو مانوں۔

ماموں جان ایک کامیاب انسان نہیں تھے۔ اور ناکام انسان تو ہرگز نہیں تھے۔ لبِ بام پہونچ جاتے تو کامیاب کہلاتے۔ دو چار ہاتھ پہلے کمند ٹوٹ جاتی تو ناکام قرار پاتے لیکن ان کی صورتِ حال ان دونوں کیفیتوں سے مختلف تھی۔ نہ وہ کبھی منزل پر پہونچے، نہ غالباً پہنچنا چاہتے ہی تھے۔ نہ کبھی تھک کر عزمِ سفر ختم کیا۔ وہ تو بس چلتے رہے اس یقین کے ساتھ کہ ایک نہ ایک دن منزل آجائے گی۔ یہ ذوقِ سفر اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ اگر کبھی منزل قریب بھی آئی تو یہ پہلو بچا کر آگے بڑھ گئے۔ اور یہ کسی ایک دور ایک عہد کی بات نہیں۔ جس نے اسّی سال سے زیادہ عمر گزاری ہو۔ اور اس عمر کا ہر عہد، ہر لمحہ بس چلتے چلتے گزارا ہو۔ نہ کبھی تھکن ہوئی نہ سانس پھولی۔ نہ دم اکھڑا۔ نہ چال بدلی۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ چلنا میکانکی عمل نہیں تھا۔ یہ ہمہ وقت ایک پُرعزم راہ رو تھا کہ جس کا ولولۂ تازہ کبھی کہنہ نہیں ہوا۔ جیسے کبھی اپنی راہوں سے بدگماں نہیں ہوئی جیسے کبھی اپنی رفتار پر بے یقینی نہیں ہوئی۔

جوانی میں کشتی کا فن سیکھنے لگے۔ بنوٹ کے گر آزمائے گھڑ سواری کا شوق کیا۔ کشتی تو پنجاب کے ایک پہلوان سے زور آزمائی کرکے اختتام کو پہونچی۔ بنوٹ کے فن متروک ہوگیا۔ گھڑ سواری ہجرت کی نذر ہوگئی۔ شادی ہوئی تو مرضی کے خلاف۔ لیکن قسمت کی اس ستم ظریفی کو انھوں نے جوانمردی سے ایک مہم کی طرح سر کیا۔ عثمانی جان۔ داغِ مفارقت دے گئیں۔ دوسری بار شادی ہوئی زندگی کا ایک تجربہ عظیم ماموں جان نے دیا تھا۔ حق ادا کر دیا۔ ملازمت کی تو قدم قدم پر ناانصافیاں بد دلی کے مواقع فراہم کرتی رہیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۵ء تک مسلسل اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہے۔ انتظامیہ نہ سنتی تو عدالتوں میں جاتے۔ عدالت انصاف دیتی تو عملدرآمد کے لئے سرگرداں ہو جاتے۔ کوئی اور ہوتا تو حوصلہ شکنی کے لاتعداد مرحلوں پر کب کا ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔ لیکن اللہ بخشے ماموں جان کا عزمِ جواں کہ زندگی کی آخری سانس تک پوری تندہی سے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مطالبۂ حق میں ثابت قدم رہے۔

کرکٹ کھیلنے کا شوق ہوا تو پورے التزام و اہتمام سے کھلاڑیوں کی صف میں داخل ہوئے اکثر بارہویں کھلاڑی رہے۔ شاید کسی میچ میں ایک آدھ اوور گیند بھی پھینکا ہو۔ بیٹنگ کی باری اس سے بھی کم آئی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کی کھیل سے وابستگی والہانہ رہی "ٹی وی" پر میچ دیکھنا بہترین مشغلہ تھا۔ اور خوبی یہ تھی کہ پاکستانی ٹیم کے پاس کھیلنے کے لئے ایک گیند رہ گئی ہو اور اسے دس رنز بنانے ہوں تب بھی ماموں جان کو اپنی ٹیم کی کامیابی کا یقین کامل ہوتا۔

ہومیوپیتھک سے دلچسپی پیدا ہوئی ۔ باقاعدہ "ایم ڈی"
کی ڈگری حاصل کی۔ دورانِ ملازمت فارغ وقت میں "مطب" کرتے
لیکن سماعت روٹھ گئی ۔ مریض کا حال سننا ممکن نہ رہا، نسخہ کیا لکھتے ۔
خطابت کے لئے بہت محنت کی ۔ سینکڑوں تقریریں لکھ ڈالیں ۔ اور
لطف یہ کہ لکھنا تو محض تکلف تھا ۔ جو کچھ لکھا وہ لفظ بہ لفظ یاد رہتا ۔
ان کا ایک مجموعۂ تقریر میری کوتاہی سے دُھل گیا ۔ آدھے آدھے صفحے بالکل
سفید ہوگئے ۔ ڈرتے ڈرتے میں نے صورت حال بتائی ۔ ایک رنگ آ کر گزر
گیا اور دوسرے دن سے ہی یہ معجزہ رونما ہونا شروع ہوا کہ وہ اپنا رجسٹر
لے کر بیٹھتے اور یادداشت کے بل بوتے پر آدھی آدھی نامکمل سطروں کو
مکمل کرتے جاتے ۔ چند دن کے بعد ڈھائی تین سو صفحوں کا دفتر مکمل ہو چکا
تھا ۔ ان کی خطابت ستائش کی تمنا اور صلے کی اُمید سے بے نیاز تھی ۔ ایک فقط
خلوص تھا ۔ لیکن اس جنسِ نایاب کے قدردان کہاں ۔ مگر کبھی بے مہریِ زمانہ
کی شکایت نہیں کی ۔ عمر کے آخری چار پانچ سال میں تو خود مقرر ہوتے اور خود
ہی سامع لیکن نہ شوقِ مطالعہ کم ہوا نہ مسودوں کی تیاری رکی ۔ جو دیکھتا وہ
یہی سمجھتا کہ نہ معلوم کتنے عشروں کی مجلسیں پڑھنی ہیں ۔

تعلقہ دار باپ کے بیٹے تھے ۔ یقیناً راحتوں میں آنکھ کھولی تھی،
مگر ہجرت نے بڑوں بڑوں کے بل نکال دیئے ۔ یہ راولپنڈی آگئے، یہاں
بھا بڑا خانہ کے ایک تنگ و تاریک مکان کی نچلی منزل میں ڈیرہ ڈالا کھلی
فضا کا مکین، ایسی جگہ رہ رہا تھا کہ اگر دن کو چراغ نہ جلتے تو رات دن نے

کا امتیاز بھی نہ ہو پاتا۔ پانی گلی میں سرکاری نلکے سے بھر کر لانا پڑتا۔ اِدھر ممانی جان کا شوقِ طہارت غلو کی تمام حدوں سے بڑھا ہوا۔ جوانی کا کسرتی بدن آب برداری کے کام آیا۔ باپ کا بڑا دسترخوان تھا۔ ظاہر ہے کھانے پینے کا بھی شوق رہا ہوگا۔ مگر اب فقط دو چپاتیوں کا کھانا۔ ممانی جان نے ایک وقت پکا لیتیں تو دو تین وقت چل جاتا۔ ورنہ دودھ میں رس ڈالا، اور اللہ اللہ خیر صلا۔ ممانی مرحومہ زود رنج بھی بہت تھیں۔ مزاج کا جوار بھاٹا الگ طوفان اُٹھائے رکھتا تھا، لیکن ماموں جان تھے کہ خواہشات سے دامن چھڑاتے قناعت کی چادر اوڑھے حرفِ شکایت کے بغیر مطمئن تھے۔ بے حسی والا اطمینان نہیں شکست خوردگی والا سکوت نہیں۔ بلکہ انھوں نے تمام صداقتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور اب اِسی صحرا کو گلستاں بنانے پر تُل گئے۔ خطابت، مُلّاگری، کھیل اور پھر اسی کلبۂ احزان جیسے گھر میں مجلس ماتم۔ غرض جس گھر کو تمناؤں کا قبرستان ہونا چاہیے تھا۔ وہی اُمیدوں کا گہوارہ بن گیا۔

اِن کے مکان کے بالائی حصہ میں ہاشم نقوی مرحوم رہتے تھے انھوں نے پورے مکان کی مِلکیت کا دعویٰ کر دیا۔ ماموں جان نے اس مقدمہ بازی کو بھی کھیل کی طرح کھیلا۔ مدعی اور مدعا علیہ ساتھ کچہری جاتے اور بعد میں ساتھ ہی اپنے اپنے وکیلوں کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے گھر آجاتے۔ آخر ایک دن عدالت نے ماموں جان کو گھر سے بیدخل کر دیا۔ اسی اثناء میں ملازمت سے بھی ریٹائرمنٹ لے چکے تھے۔ راولپنڈی میں

ان کے بھانجے موجود تھے۔ انھوں نے بے سروسامان ماموں کو سر آنکھوں پر بٹھایا، اور ستائیس اٹھائیس سال کا مسکن ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔

مکان کے محاذ پر پسپائی ہوئی تو انھوں نے ایک نیا محاذ قائم کیا اب ان کا ہدف تھا کہ ایک مکان اپنا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ شہر کے نواحی علاقہ میں ایک زمین خرید رکھی تھی، اس کی طرف متوجہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ تو اسلام آباد کے حدود میں ہے، چنانچہ تعمیر ممکن نہیں، اب قانونی جنگ شروع ہوئی۔ "سی ڈی اے" محتسب اعلیٰ ضلعی حکام اور پھر صدر مملکت، وزیر اعظم سب کے دروازے کھٹکھٹائے گئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ان کی زمین کے بدلے انھیں اسلام آباد میں ایک رہائشی پلاٹ دیا جائے تاکہ وہ اپنا گھر بنا سکیں۔ تقریباً دس سال معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ نتیجہ صفر ہی رہا۔ لیکن ماموں جان کا اصرار تھا کہ پلاٹ ان کا حق ہے اور وہ لے کر رہیں گے۔ اور پھر وہاں مکان بنے گا۔ اور وہ انکا اپنا مکان ہوگا۔ ۱۹۹۳ء میں میں نے ایک مکان بنوانا شروع کیا۔ انھیں زیر تعمیر مکان دکھایا۔ ان کے لئے ایک کمرہ مخصوص تھا۔ انھوں نے مکان دیکھا۔ بہت خوش ہوئے۔ اپنے نام منسوب کمرہ دیکھا مزید خوشی کا اظہار کیا، اور اس کے ساتھ ہی اعلان کیا کہ میں اپنے مکان کو تو مختصر سا بنواؤنگا۔ بس دو تین کمرے کافی ہوں گے۔ پھر ۱۹۹۵ء کے آغاز میں ہم نئے مکان میں منتقل ہوگئے۔ اب ماموں جان علیل ہوچکے تھے۔ علالت کے باوجود انھیں نقل مکانی

بہت خوشگوار محسوس ہوئی۔ نئے گھر میں انھیں دھوپ بڑی فراواں ملتی تھی، سارا دن دھوپ میں لیٹے رہتے اور غالباً اپنے گھر کا نقشہ بناتے رہتے گا ہے گاہے یاد دلاتے رہتے، میں نے وزیر اعظم کو جو خط لکھا ہے اس کا جواب آنے ہی والا ہوگا۔ انھوں نے تو بیان بھی دیا ہے کہ بے گھر لوگوں کو گھر دیے جائیں گے۔ پتہ نہیں ان کا دیا ہوا گھر کیسا ہوگا۔ پھر کبھی کہتے کہ ذرا شاہد میاں کو ٹیلیفون تو کرو وہ وکیل ہے بلکہ انھیں ملازمت کے مقدمہ کے بارے میں یاد دہانی کرا دیں۔ میرے بقایاجات مل جائیں تو اس سے مکان بنواؤں گا۔ نہ وزیر اعظم کی طرف سے ان کے خط کا جواب آیا نہ ان کی ملازمت کے بقایاجات ملے البتہ پیغام اجل ضرور آگیا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء کو انتہائی سکون سے اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اگلے دن جنازہ اٹھا۔ اسلام آباد کے عظیم الشان قبرستان میں قبر ملی۔ دفن کے بعد قبرستان کا متولی ایک رجسٹر اٹھائے ہوئے آیا کہ اس میں مرحوم کے کوائف درج کر دیں۔ اندراج کے وقت دیکھا لکھا تھا "پلاٹ نمبر ۵۹ ۔ قبر نمبر ۱۵۶ ۔ صاحب قبر کا نام سید انور حسین کاظمی"۔ ماموں جان نے آخر اسلام آباد میں رہائشی پلاٹ حاصل کر لیا تھا۔

"منتظر عباس نقوی"

(الف)

اَنور بھائی مرحوم

عام تصور ہے کہ ماضی اور مستقبل میں گہرا رابطہ و ضبط ہے۔ ماضی ہی مستقبل کے سفر کے لئے رخت سفر مہیا کرتا ہے اور حال نام ہے ماضی اور مستقبل کے درمیان عبرت حاصل کرنے کا' مگر میرے خیال میں انسان زندگی کا آغاز حال سے کرتا ہے، پھر جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس میں ماضی شامل ہوتا جاتا ہے۔ مستقبل سے تو ہمیشہ ناشارہ کر حال ہی کے گرداب میں زندگی گزار دیتا ہے۔ میرے حقیقی عم زاد بھائی انور حسین بھی ہمیشہ حال کی زنجیروں میں جکڑے ماضی کو یاد کرتے رہے اور مستقبل کی جانب کبھی توجہ نہ دی۔

ماضی' حال اور مستقبل کچھ نہیں' زندگی تو دراصل ایک کشکول ہے جس میں مقدر کی خیرات ملا کرتی ہے۔ چنانچہ انور بھائی کی زندگی کے کشکول میں جہاں ان کی ابتدائی زندگی کے نقرئی سکے تھے وہاں شادی، اولاد اور ملازمت کے کھوٹے سکے زیادہ تعداد میں تھے۔ میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا۔ اس لئے ان کے ابتدائی حالات اتنے معلوم نہ تھے جو اب ان کی خود نوشت پڑھنے کے بعد سامنے آئے۔ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ وہ عرصۂ دراز سے اپنے حالات لکھتے چلے آ رہے تھے۔ بعد میں کانٹ چھانٹ کرتے گئے۔

خاندانی وجاہت، کھانے پینے اور رہائش کی تمام آسائشوں میں کھیل کود۔ ورزش کشتی۔ شکار اور ہر انداز سے مطمئن رہنے والا شخص اپنے مستقبل کے سفر میں زندگی کا ساتھی اپنی مرضی سے نہ پا سکا۔ مجھے اب احساس ہوا جب میں نے اپنی یادوں کے سجے البم کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو یہ تصور ابھر کر سامنے آ گیا کہ وہ ایک زمانے میں بے چین رہا کرتے تھے۔ اور شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب ان کی تحریر نے وضاحت کر دی کہ اس انکار کی وجہ کیا تھی اور پھر مجبوراً والد اور چچا کے اصرار پر شادی کر لی، جہاں سے ان کی دکھ بھری داستان کا آغاز ہوا۔

میں اپنے ستّر سالہ تجربے کی بنیاد پر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بعض لوگ زندگی کو برتنا خوب جانتے ہیں اور کامیاب رہتے ہیں لیکن بعض لوگوں کو زندگی خود برتتی ہے۔ اپنی مرضی، اپنی خواہش اور اپنی رضا سے جیسا اس کا دل چاہے سلوک کرتی ہے۔ انور بھائی کو ان کی زندگی نے بھی انھیں اپنی مرضی کے تابع رکھا، اولاد سے محروم تھے تو اپنی جوانی ہی میں دوسری شادی کر سکتے تھے، مگر شریعت اور اسلام کو خوب سمجھتے ہوئے بھی انھوں نے ایسا نہ

کیا۔ بھابی کے انتقال کے بعد بڑھاپے میں شادی کا شوق، بچے کی تمنا کے ساتھ ہوا تو ایسی لڑکی کہاں ملتی کہ ان کی خواہش کے تکمیل کے لئے زندہ در گور ہو جاتی۔ دولت بھی تو اتنی نہ تھی کہ اس کے حصول کے لئے کوئی لڑکی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتی۔ بہر حال ان کے مقدر کی خیرات میں اولاد کا سکّہ نہ تھا اور مرتے دم تک اس حسرت کا ذکر کرتے رہے۔

زیرِ نظر "خود نوشت سوانح حیات" کی ابتدا خاندانی وجاہت سے شروع ہوئی ہے۔ میں نے اس وجاہت کی تفصیل اپنی مطبوعہ کتب "واجد علی شاہ، انکی شاعری اور مرثیے" اور "سہیل مر نہیں سکتا سہیل زندہ ہے" میں درج کر رکھی ہے۔ ہمارے پردادا میر ضامن حسین، واجد علیشاہ (بادشاہ اودھ) کے منظورِ نظر لوگوں میں تھے۔ بھلا واجد علیشاہ کے بعد انگریز ہمارے پردادا کو کیسے چھوڑتے۔ بہر حال پدرم سلطان بود سے ہٹ کر بھی میرے والد نے موروثی جائیداد میں اضافہ کیا، انور بھائی نے اس کا بھی ذکر کر دیا مگر اتنا ذکر رہ گیا کہ وہ سب ہم لوگ اپنے نئے وطن پاکستان پر قربان کر کے آ گئے اور ہمارے چچازاد بھائی اصغر حسین نے مجھے اور میری بہن مسعودہ کو مُردہ دکھا کر جائیداد پر قبضہ کر لیا اور اب وہ سب ان کے بیٹے زائر حسین کے تصرف میں ہے۔ ہماری پاکستان آمد پر کسی فی الحال

نے خوب کہا ہے کہ ع :- ہم اِک حسین بہار کے دھوکے میں آگئے ؛ سلوتن میں اپنے گھر میں محرم کی یاد میں تو خون کے آنسو بہتے ہیں۔ تین بڑے گشت ہمارے گھر سے نکلتے جن میں عام لنگر کھلا رہتا۔ اونٹوں پر روٹیاں تقسیم ہوتیں اور ہاتھی گھوڑوں پر علم کے ساتھ ماتمی جلوس بڑے بڑے علم اور تعزیے اٹھائے رواں دواں رہتے۔ جس میں مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے کمسنی ہی سے انجمن کا صاحبِ بیاض تو میں خود تھا۔ بہرحال اب ان عظیم لمحات کی یاد ہی یادباقی ہے جسے انور بھائی نے اپنی تحریر میں تازہ کردی۔

انور بھائی نے اپنے ہاکی کھیلنے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اس اظہار میں بھی خاندانی روایت شامل ہے میرے والد مظفر حسین مرحوم علیگڈھ یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم کے کھلاڑی، میرے بڑے بھائی مشتاق حسین مرحوم ہاکی اور فٹ بال دونوں نہایت عمدہ کھیلتے اور پولیس ٹیم کے مستند کھلاڑی تھے، میں لکھنؤ یونیورسٹی کی ہاکی اور بیڈمنٹن ٹیموں کا کپتان رہا۔ ہمارے ایک بھانجے مہدی حسن علیگڈھ ٹیم کے کھلاڑی ہونے کے ساتھ ساتھ "یو۔پی" کی ہاکی ٹیم کے مشہور سینٹر ہاف تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہم دو سگے، چار چچازاد بھائی اور دو سگے بھانجے مہدی حسن اور امیر حسن ملا کر سب کے سب چھٹیوں میں جمع

ہوتے تو قرب و جوار کی ٹیموں کو میچ کھیلنے کا چیلنج دیتے۔ بیک تین مقامی کھلاڑی شامل کرتے اور ہمیشہ کھیل میں فتح حاصل کرتے۔ ایک مرتبہ وَالی بال کھیلنے کا چیلنج ملا۔ اس کھیل سے ہم لوگوں کو کوئی واسطہ نہ تھا، مگر اطہر بھائی وَالی بال کے کھلاڑی تھے۔ ان کی لمبائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم لوگ تیار ہو گئے۔ وہ نیٹ پر جو ڈالی لگاتے کسی سے نہ اٹھتی اور اس طرح والی بال کا میدان بھی سر ہوا ہاکی کو خاندانی کھیل کہنا اسطرح بھی ثابت ہوتا ہے کہ میرے دو بیٹے غضنفر حسین اور سہیل مرحوم کیڈٹ کالج حسن ابدال کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔ وہاں کا انگریز پرنسپل جیپ مین ملتا تو ان کے کھیل کی بڑی تعریفیں کرتا۔ میرے دوسرے بیٹے فہیم "ڈی۔ جے" کالج کے اور کلیم جبیب پبلک اسکول کی ہاکی ٹیموں کے مانے ہوئے کھلاڑی گنے جاتے تھے۔ یہ خاندانی اثرات نہیں تو اور کیا ہے۔ اور انور بھائی نے اپنی سرگزشت میں اس کی یاد تازہ کر دی۔ وہ کھیل میں کھو کر زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے انٹر میں فیل ہو گئے تو بولے کہ سب اچھے لڑکے فیل کر دیئے گئے۔ پھر والد صاحب نے انھیں تعلیم ختم کرا کے جائیداد کے انتظام میں لگا دیا۔

اس سرگزشت میں ایک اور تفصیل جو سامنے آتی ہے وہ انور بھائی کے مجالس پڑھنے کی ہے۔ یہ ایک

حقیقت یہ ہے کہ مدّاحیِ اہلبیتؑ اور شہادتِ عظمیٰ کے واقعات سے انھیں ابتداء ہی سے جذباتی اور عقیدت مندانہ لگاؤ تھا جس کے اِظہار میں انھوں نے مجلسیں پڑھنی شروع کیں۔ ان مجالس کی تقاریر سے ان کے ذوق و شوق اور جوش و جذبہ کا بھرپور اظہار ملتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابتدائی مجالس پڑھنے میں وہ اشعار بھی پڑھتے جو ہمیشہ ناموزوں اور غلط ہوتے۔ ایک دن سب بھائی ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے کہ آپ اشعار پڑھنا چھوڑ دیں تو مجالس اچھی پڑھیں گے۔ اور واقعی پھر آخر دم تک شعر نہ پڑھا۔ جس کی وجہ سے مجالس میں کبھی جھول نہ آیا اور وہ کامیاب ذاکر رہے۔

ان سب اذکار کے بعد زیادہ حصّہ انکی ملازمت سے تعلق رکھتا ہے جس میں وہ ہومیوپیتھک علاج بھی کیا کرتے تھے۔ اس عرصہ میں مَیں نے محسوس کیا کہ انور بھائی زمانے کی روش کے مطابق چلنے والوں میں نہ تھے۔ ان کے ہر انداز میں پرانی روایات و اقدار ملتے تھے جس سے یقین تھا کہ وہ نئی روشنی، نئے حالات اور رنت نئے سر اُبھارتے تقاضوں سے کوئی سروکار نہ رکھتے ہوئے صرف اپنی پرانی روش پر چلنے کے قائل تھے جس سے اکثر لوگ مذاق کی حد سے تجاوز کر کے ان سے فائدہ

حاصل کرتے تھے ۔ یا یوں سمجھئیے کہ وہ اتنے سادہ مزاج تھے کہ بات کی تہہ تک نہ پہونچ سکتے تھے ۔ جس زمانے میں میں ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات راولپنڈی ریجن تھا تو دورے کی واپسی پر سیدھے ان کے گھر ان سے ملنے چلا گیا ۔ ان کے کچھ احباب مطب میں بیٹھے ہوئے مٹھائی کھا رہے تھے ۔ وجہ معلوم کی تو بتلایا کہ آج ڈاکٹر انور صاحب کو کرکٹ میں کوئی بولر آؤٹ نہ کر سکا اور وہ بیٹ اِن ہینڈ آئے وہ اس خوشی میں مٹھائی کھلا رہے ہیں ۔ میرے استفسار پر کہ " رن " کتنے بنائے سب بول اٹھے کہ اس کا موقع ہی نہ ملا ، سب آؤٹ ہو گئے اور انور بھائی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا ۔ اب یہ معصومیت نہیں تو اور کیا ہے ؟ ۔

اسی طرح ایک مرتبہ " بی اے " کے امتحان میں صرف انگریزی مضمون کا پرچہ دے کر آئے ۔ پرچہ دکھلایا ، جس میں تحریر تھا کہ کسی مضمون پر ٹو پوائنٹس تحریر کیجئے اور مضمون لکھیے ۔ مَیں نے جب پوچھا کہ مضمون کس عنوان پر لکھا تو بولے کہ نمبر (۱) پر تو پوائنٹس لکھے اور تین والے پر بہترین مضمون لکھ دیا ۔ مَیں نے کہا نمبر صفر میں گئے ۔ آپ کو جس پر ٹو پوائنٹس لکھنا تھا ۔ اُسی کی وضاحت کرتے ہوئے مضمون تحریر کرنا تھا ۔ سخت ناراض ہوئے کہ تم لوگ تو اپنی قابلیت کے سامنے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ۔ نتیجہ آیا تو ان کا رول نمبر غائب تھا ۔ ان کو پھر بھی یقین نہ آیا تو میرے دفتر آئے اور کہا کہ لاہور یونیورسٹی فون کر کے معلوم کرو ۔ شاید غلطی سے میرا نمبر رہ گیا ہو ۔ انھیں کے سامنے فون کیا جس کا نتیجہ ظاہر تھا ۔ دوسرے سال پھر امتحان دیا تو پاس ہو گئے

اور مسکرا کر کہنے لگے کہ تمہاری ہی بات درست تھی۔

غصہ تو انسانی سرشت ہے۔ کہیں دودھ کا اُبال اور کہیں آپے سے باہر۔ اَنور بھائی غصہ میں آتے تو اُس کی بھی حد تھی' وہ جلد ہی اُتر جاتا۔ وہ اس بات پر بے حد ناراض تھے جس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ ان کی بیگم کی جائیداد کے کاغذات ولایت حسین چچا نے اپنے خاندان میں منتقل کرلئے اور وہ اس حق سے بھی محروم کر دیئے گئے' کہ پاکستان میں کلیم کرتے اور صاحبِ جائیداد ہوتے۔

دوسرا غصّہ اِس پر تھا کہ حکومت نے انھیں جان کر ترقی نہ دی' تیسرا غصّہ اس پر تھا کہ پوری پنشن نہ دی گئی' چوتھا غصہ اِس پر تھا کہ اِسلام آباد میں زمین خریدی اور حکومت نے نہ زمین دی اور نہ پیسے ہی واپس کئے' زیادہ غصّہ اِس بات پر تھا کہ مقدمہ لڑتے' فیصلے انکے حق میں ہوتے لیکن حکومت اس پر عمل نہ کرتی۔

اپنے عزیزوں پر غصّے کے سلسلے میں مجھے ان کی ایک بات بےحد پسند آئی کہ انھوں نے غصّہ آنے پر بھی کسی عزیز کی بُرائی نہیں کی گویا غیبت جیسے عظیم گناہ سے انھوں نے اپنے کو بچائے رکھا۔ بھابی کے اِنتقال کے بعد اپنے حقیقی بھائی (اظہر حسین) سے ناراض ہو کر میرے پاس مستقل سکونت اِختیار کرلی لیکن برائی نہ کی۔ راولپنڈی میں عرصہ تک قیام کیا۔ کبھی اپنے بھانجوں (شاہد میاں، منتظر میاں، اختر میاں) اور کبھی بھتیجی (اچھی سلمیٰ) کے پاس رہتے۔ ناراضگی کے ساتھ ایک دوسرے کے یہاں

وقتاً فوقتاً سے منتقل ہوتے رہے لیکن کسی کی برائی نہیں کی۔ وہ لوگ بھی انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ورنہ اس مطلب پرست دنیا میں کون کسی کا خیال کرتا ہے۔ ان کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل ہم لوگوں کو ملک سے باہر جانا تھا۔ ہم یہ نہ چاہتے تھے کہ گھر میں وہ تنہا رہیں۔ ادھر ان کا اصرار کہ نہیں ملازم ہے۔ کمپاؤنڈر اور دوسرے ڈاکٹر آتے رہیں گے۔ وہ تنہا رہ لیں گے پھر بھی ہمارا دل نہ مانا۔ بولے اچھا اطہر کے پاس رہ لیں گے دو ایک ماہ کی بات ہے۔ میں نے اطہر بھائی کو فون کیا لیکن گھر میں جگہ کی قلت کے باعث انھوں نے رکھنے سے معذرت کر لی تو انور بھائی نے اس بات کا بھی برا نہ مانا اور کوئی شکایت نہ کی۔ آخر کار راولپنڈی اپنے مقدمے کی پیروی کے حوالے سے روانہ ہو گئے۔ یہ گویا ان کی مٹی کی آواز تھی۔ میں تو کہوں گا کہ وہ بڑے خوش قسمت تھے کہ راولپنڈی جا کر منتظر میاں کے ساتھ رہے۔ منتظر سلّمہٗ نے جس انداز میں ان کی خدمت کی شاید اپنی اولاد بھی شاید اتنا نہ کر سکتی۔

زیارات کی واپسی پر فون آیا کہ ان (انور صاحب) کی حالت بہت خراب ہے۔ میں اسی تھکن کی حالت میں راولپنڈی جانے کی تیاری کرنے لگا کہ ان کا کفن میرے پاس تھا کہ اسی اثناء دوسرا فون آگیا کہ انتقال ہو گیا۔ بہر حال میں پہنچ گیا اور انھیں قبر میں اتار دیا گیا۔ اس طرح ایک تاریخ دفن ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ۔

اپنے آخری زمانے بلکہ ریٹائر ہونے کے بعد ہی سے انور بھائی گوشہ نشین ہو گئے۔ یوں بھی بہت اونچا سننے کی وجہ سے محفلوں سے کتراتے ہوئے صرف

اپنی ذات تک محدود تھے۔ دراصل وہ دورِ جدید کو برتنا بھی نہ جانتے تھے جو انسانیت کو دولخت کرنے، انتشار، بے چینی اور تہذیبی قدروں کی پامالی کا دور ہے جہاں قحطِ انسان کے ساتھ اخلاقی پستیوں کا ماتم ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں وہ انصاف تلاش کرتے رہے۔ بھلا انھیں انصاف کون دیتا۔

مجھ سے انھوں نے چند خواہشات کا ذکر کیا تھا۔

(۱) ان کا ٹوٹا پھوٹا جو کچھ بھی قدیم اثاثہ ہے۔ اس میں سے کچھ ان کی یاد تازہ رکھنے کے لئے تبرکاً اپنے استعمال میں ضرور رکھ لوں۔ چنانچہ ان کی زندگی ہی میں نماز کی چوکی اور چھوٹا قالین، کتب خانے میں ڈال لیا تھا۔ انتقال کے بعد ظروف بھی اور تمام اعزہ کی مرضی سے غریبوں میں تقسیم کر دیا۔

(۲) دوسری خواہش یہ تھی کہ مجالس پڑھنے کا ذخیرہ ان کے قابلِ فخر بھانجے مسٹر عباس کے حوالے کر دیا جائے جنھوں نے فنِ خطابت کے ایک منفرد انداز میں شہرت حاصل کی ہے۔ چنانچہ یہ ذخیرہ ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس خواہش سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اپنی فکر و نظر اور بصیرت کو انھوں نے اپنے ساتھ دفن ہونے سے بچا لیا۔

(۳) تیسری خواہش ان کی تحریر چھپوانے کی تھی۔ ہومیوپیتھک دواؤں پر تحریر تو ایسی نہیں کہ اس پر پیسہ ضائع کیا جائے۔ صرف یہی خود نوشتہ سوانح حیات ہے جسے شائع کیا جا رہا ہے۔ ایسے بھی پڑھنے کا وقت کس کے پاس ہے اور کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ صرف خواہش کا احترام ہے۔

(۴) چوتھی اور آخری خواہش میں میرا سخت امتحان تھا۔ بھائی مرحوم کا

زیور اور تمام نئے برتن فروخت کرنے کے بعد پنشن کی رقم ملا کر انھوں نے کل رقم بینک اور سارٹیفکٹ کی صورت میں رکھا تھا۔ اور ہر جگہ وراثت میں میرا نام درج کر دیا۔ مجھ سے بولے کہ یہ سب تمہارا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ چچا (یعنی میرے والد) میرے لئے کیا تھے۔ میرے وہ روحانی باپ تھے۔ میری تعلیم و تربیت سب انھیں کے حوالے سے ہے۔ جس محبت سے وہ پیش آتے تھے وہی محبت مجھے تم سے ملی۔ اس لئے میرے اصل وارث تم ہو۔ میں نے تحریری مخالفت کی لیکن وہ نہ مانے۔ ہُوا بھی یہی کہ اس طرح انتقال کے بعد بجز میرے ان کی رقم کوئی نہ حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے بنک کی رقم اور سارٹیفکٹ کا مکمل حساب نکلوا کر سب اعزہ کو مطلع کر دیا تھا۔ کل رقم 87179/34 روپے ہیں۔ کفن دفن اور فاتحہ کے بعد کل رقم 81303/- روپے بچی۔ چونکہ وہ حج کرنے کی خواہش رکھتے تھے اور خمس میں حقِ امام کے دس ہزار روپے علامہ رضی جعفر صاحب کو اور دس ہزار روپے ایک عزیز یتیم لڑکی کی شادی پر ادا کر چکے تھے اس لئے انکے لئے حج بدل کرانا ضروری ہے۔ میری اس خواہش کا سب نے احترام کیا اور اطہر بھائی کے مشورے سے میرے اور ہلال میاں کے نام سے ایک جوائنٹ اکاؤنٹ نمبر 8-7366 نیشنل بنک ناظم آباد کراچی کھولا گیا۔ طے پایا کہ انکے سارے کام اس اکاؤنٹ سے انجام دیئے جائیں گے۔ سات ہزار روپے دے کر محسن میاں کے ذریعے قبر پختہ کرائی گئی۔ حج بدل کیلئے مہدی میاں (فرزند مجھلی بہن) کا انتخاب ہوا اور 52536/- روپے کا چیک دیگر

حج بدل کا انتظام کر دیا گیا۔ اور اس خود نوشت کی اُجرت کتابت
مبلغ بائیس ۲۲ روپے فی صفحہ دی گئی۔ اب جو رقم چھپائی پہ خرچ ہو گی
اس کا حساب بعد میں ہو گا۔ کتاب دو سو ۲۰۰ سے زیادہ نہ چھپے گی کیونکہ
یہ کوئی علمی یا ادبی کارنامہ تو نہیں کہ فروخت ہو۔ صرف اعزّہ اور احباب
میں تقسیم ہو گی۔ باقی رقم سے ان کیلئے مجالس چالیسواں، چھ ماہی
اور برسی ہوئی ہے۔ اور آئندہ بھی مجالس اور فاتحہ ہوتے رہیں گے۔ اگر
کبھی رقم ختم بھی ہو گئی تو یہ میری ذمہ داری ہو گی کہ انور بھائی اور بھابی کا
فاتحہ ہوتا رہے۔ خود نوشت کے آخری الفاظ بھی یہی ہیں "یہ روپیہ
پیسہ بھائیوں کے لئے ہے۔ جی چاہے تو کبھی کارِ خیر میں خرچ کریں۔"
التماس ہے ایک سورہ فاتحہ۔ آپ بھی کتاب پڑھیں تو انور حسین
ابنِ محمد حسن اور صغیر بانو بنتِ وزیر حسین کے نام سورہ فاتحہ پڑھ دیں۔

انور بھائی مرحوم کی اس ایک سو سے زائد صفحات کی خود نوشت
تلخابۂ حیات میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ آپ پسند کریں
یا نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے مصائب میں جینا اور
مسکرانا سیکھا، مشاہدے اور تجربے کی تلخ حقیقتوں میں غموں کا بوجھ
اٹھائے خاموشی سے زندگی گزار دی۔ بقول ایک شاعر ؎

گزری تمام عمر اِسی احتیاط میں
میرے غموں کا بوجھ کسی اور پر نہ ہو

یہ خود نوشت انور بھائی مرحوم ہی کی داستانِ محرومی نہیں، بلکہ

پاکستان میں خلوص، دیانتداری اور انتھک محنت سے کام کرنے والوں کو حق و انصاف نہ ملنے کی المیّہ کہانی ہے۔ اس میں پاکستان کے تمام حکمرانوں کی بے حسی اور ناانصافیوں کی تاریخ ہے۔ اُبتک لوگوں کی تمام نیک خواہشات سراب ثابت ہوئیں۔ محبت، اخوّت، خلوص، حق اور انصاف کب ملے گا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مجھے تو آج بھی بھائی انور حسین مرحوم کی انصاف کے حصول کے لئے بھٹکتی روح کی آواز کسی شاعر کے ایک شعر میں سنائی دیتی ہے ؎

فریب دے گیا ہم کو پیامِ آزادی
قفس سے لا کے چمن میں بہار نے مارا

سیّد منظر حسین کاظمی
۱۵ر نومبر ۱۹۹۵ء

راقم الحروف کو سید انور حسین کاظمی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ پیدائش جو بزرگوں نے بتلائی۔ اور اسکول میں لکھائی گئی وہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۲ء ہے جائے ولادت محلہ ملکیانہ سلون آئمہ ضلع رائے بریلی (اودھ) یوپی بھارت ہے۔ جو سرکار عالیہ برطانیہ کے زیر حکومت ہے۔ احقر کے والد بزرگوار قاضی سید محمد حسین آنریری مجسٹریٹ، آنریری اسسٹنٹ کلکٹر ہیں۔ راقم الحروف اپنے زمانۂ طفولیت میں برابر والد صاحب کو گھر ہی پر مقدمات کی سماعت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ رائے بریلی سے وکلاء مقدموں کی پیروی کرنے آتے رہے یہ سلسلہ چودہ سال تک قائم رہا۔ بعدہٗ کانگریس کا زمانہ آگیا۔ مذہبی تعصب کی بنا پر مقدمات کی سماعت روک دی گئی لیکن یہ عہدے والد صاحب کے نام کے ساتھ اس کا جزو قرار پاگئے اور برابر خطوط وغیرہ میں نام کے ساتھ یہ عہدہ ضرور لکھا جاتا رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر سا ذکر اپنی خاندانی وجاہت کا بھی کر دوں جس کے موروثی اثرات آج تک خون میں رواں دواں ہیں، اور

تاحیات وہ اپنی موروثی صفات کے ساتھ قائم ودائم رہینگے
واضح رہے کہ اِس ناچیز کا تعلق خاندانِ نوابین سے ہے۔ میرے
پردادا، تین بھائی تھے جو تین سو مواضعات کے مالک تھے،
ایک بھائی ضلع آگرہ کا انتظام دیکھتے تھے۔ دوسرے بھائی
ضلع غازی پور کی ریاست کا بندوبست کرتے تھے اور تیسرے
بھائی جو میرے اصل پردادا تھے۔ جن کا اسم گرامی سیّد ضامن حسین
تھا۔ وہ ضلع الہٰ آباد اور ضلع فتحپور (ہسوہ) کا انتظام سنبھالے
ہوئے تھے اور دونوں اضلاع کے درمیانی علاقہ سینی میں
ہیڈکوارٹر قائم کیا ہوا تھا۔ اصل رہائشی مکان قصبہ اِیرا نواں[1]
سادات، تحصیل کھاگا، ضلع فتحپور (ہسوہ) میں تھا، جس کے
کھنڈرات میں پتھروں کے ستون میں نے بھی زمانۂ طفلی میں دیکھا
ہے اور وہ محل کے نام سے آج تک موسوم ہے حالانکہ
اب اس محل کی بنیادیں بھی نظر نہیں آتیں۔ میرے تینوں پردادا
جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء میں جو انگریزوں سے
جنگِ آزادی لڑی تھی اور جسے حکومت کے اثرات کی بنا پر ۱۸۵۷ء
کے غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس میں انگریزوں سے جنگ
کی۔ لیکن جب بعد کو انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو احقر کے تینوں

---

[1] موجودہ نام ایرایاں سادات ہے۔

پردادا قید کر لئے گئے اور کُل ریاست ضبط کر کے جاسوں پر تقسیم کر دی گئی۔ میرے پردادا جو قید میں تھے اُن کو عرصہ چھ ماہ میں آہستہ اثر کرنے والا زہر دیا گیا اور قید کی حالت ہی میں اُن کا اِنتقال ہو گیا۔ والدین سے سُنا ہے کہ جب میری پردادی ان لوگوں سے قید خانے میں ملنے جاتی تھیں تو وہاں کے نگرانوں کو اشرفیوں کی تھیلی پیش کرتی تھیں۔ غرضیکہ ان بزرگوں کا جب اِنتقال ہو گیا تو جو بھائی ضلع آگرہ کا اِنتظام دیکھتے تھے اُن کی قبر تاج محل کی چوحدی کے اندر کہیں واقع ہے۔ دوسرے جو بھائی ضلع غازی پور کا اِنتظام کرتے تھے۔ اُن کی قبر بھی غازی پور میں بنائی گئی اور وہ کچھ ایسے بزرگ مشہور تھے کہ آج تک اُن کی قبر پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں اور لوگ دُعائیں مانگتے ہیں۔ تیسرے پردادا جو میرے اصل پردادا تھے اُن کی قبر علاقہ سیتی میں بنائی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری عمر تقریباً دس بارہ سال کی ہو چکی تھی اُس وقت غازی پور میں دریائے گنگا کا رُخ بدل گیا، بہت سا علاقہ جو دریا بُرد تھا وہ دریا برآمد ہو گیا تو میرے والد صاحب اُس علاقے کا مقدمہ انگریزوں سے لڑے تھے کہ وہ حصہ ریاست کا ضبطی میں نہیں آیا تھا۔ لہٰذا وہ ہمیں دیا جائے لیکن انگریز حکومت نے منظور نہیں کیا۔ بہرنوع تینوں پردادا کے اِنتقال کے بعد اور

ریاست کی ضبطی کے بعد میرے دادا سید بخشش علی (مرحوم) جنکے ہمراہ والد صاحب سید محمد حسین اور چچا سید مظفر حسین صاحب جن کی عمریں دس بارہ سال کی تھیں نان شبینہ کو محتاج ہوگئے چونکہ دادا صاحب کی ایک سگی بہن، سلون آئمہ ضلع رائے بریلی میں قاضی سید ہاشم علی مرحوم کو منسوب تھیں اور اُن سے متعدد بچّے ہوئے تھے جو زندہ نہ رہے تھے۔ اس بنا پر قاضی ہاشم علی نے میرے دادا سید بخشش علی کو معہ بچّوں کے اپنے یہاں بلا لیا اور والد سید محمد حسین و چچا سید مظفر حسین کو متبنّیٰ کرلیا۔ اس طرح یہاں کی جائیداد کی ملکیت حاصل ہوئی۔ مواضعات کی تفصیل نیچے درج ہے:-

موضع گوپال پور اُدھون۔ موضع قمر علی کا پورہ موضع گنگہرہ گلال گنج۔ مقرن کا پورہ۔ اہروں کا پورہ۔ مہابیر کا پورہ۔ پورہ سعید۔ سلون آئمہ۔ اونہ نیس۔ انکے علاوہ جزوی حصّہ داری کے مواضعات یہ تھے:- براڈیہہ۔ گوا۔ اِٹارہ سونچی۔ سمیری جبکراسی۔ گوکنا کھاٹ۔ یہ تمام مواضعات ضلع رائے بریلی تحصیل سلون میں واقع تھے۔ جس میں بڑا حصّہ چچا مظفر حسین کا تھا جنھوں نے اپنے بیٹوں مشتاق حسین کاظمی اور منظر حسین کاظمی کے نام سے خریدا تھا جو انگریزوں کے جانے کے بعد اور ہندو پاک کی تقسیم کے بعد بھارت حکومت نے ضبط کرلیا۔ صرف رہائشی مکان

سپرو سارُ چھوڑ دی جو اس وقت ناچیز کے بڑے بھائی اختر حسین جو ابھی بقید حیات ہیں، اُن کے قبضہ میں ہے۔ گویا اِس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں کا تسلط ہُوا تو میرے خاندان کی تباہی آگئی۔ اور جب یہاں سے انگریز واپس گئے تو رہی سہی حیثیت کو بھارت حکومت نے ضبط کرلیا۔ یعنی ہر تبدیلی میں ہمارے اوپر زوال آیا۔ یہی شاہی زمانے کا خون آج تک ہماری رگوں میں موجزن ہے۔ اور دُنیا کی کسی قسم کی مصیبت میں ہمارا دستِ سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوسکتا۔ اور اپنی خاندانی خو کی بناء پر کسی سائل کے سوال کو رد کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

خدا کا فضل و کرم ایسا ہوا کہ دس یا گیارہ بھائی بہنوں میں ہم صرف چار بھائی اور دو بہنیں بچے۔ مجھ سے چھوٹا بھائی اطہر حسین پاکستان ہی میں موجود ہے مگر میرے ایک بھائی یوسف حسن کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا اور مجھ سے دو بڑے بھائی سید اختر حسین و سید اصغر حسین کا اب انتقال ہوگیا۔ بہنوں میں سیدہ بیگم اور افتخار بانو دونوں کا بھی انتقال ہوگیا۔ اسی طرح چچا سید مظفر حسین کے سات آٹھ بچوں میں صرف دو لڑکے سید مشتاق حسین اور سید منظر حسین کاظمی اور بہن مسعودہ بیگم موجود ہیں۔ مشتاق حسین کا اب انتقال ہوگیا۔

میری ابتدائی تعلیم سلون ایمہ میں مڈل اسکول سے

شروع ہوئی۔ ورنہ مڈل فائنل امتحان پاس کرنے تک سلون ہی میں قیام رہا۔ اردو کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کی تعلیم بھی حاصل کیا اور اس کا بھی امتحان پاس کیا۔

مجھے "ہاکی" کھیلنے کا شوق بچپن سے رہا۔ روزانہ شام کو گراؤنڈ پر جا کر ہاکی کھیلتے۔ اس کے علاوہ اپنے محلہ ملکیانہ کے دوسرے محلّوں یعنی چودھرانا اور کتھانا سے بھی لڑکے آتے اور سب مل کر کھیلتے تھے۔ ایک دن محلہ کیتھانا کا ایک لڑکا جو دراصل سلون سے چار میل کے فاصلہ پر پرشدی پور کا رہنے والا تھا وہ بھی کھیلنے آیا تھا اُس کے دوسرے بھائی کی بسیں سلون سے رائے بریلی تک چلتی تھیں۔ اُس لڑکے سے اور میرے محلہ کے ایک لڑکے اقتدار حسین سے جھگڑا ہو گیا، میں نے اپنے محلّے کے لڑکے کا ساتھ دیتے ہوئے اس کی پٹائی کر دی۔ وہ بھاگتا ہوا اپنے محلّہ گیا، اِدھر کھیل بند کر کے ہم لوگ بھی واپس ہو گئے۔ اُدھر سے وہ لڑکا اپنے ہمراہ محمد ابراہیم عرف مُنّو اور محمد اسحاق عرف لَتّو کو لے کر لڑنے کے لئے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے دور ہی سے للکارا۔ ہم لوگ اپنے محلّے کے قریب پہنچ چکے تھے، چاہتے تو بھاگ سکتے تھے لیکن میرے ضمیر نے یہ گوارہ نہیں کیا۔ بلکہ میں انھیں آتے دیکھ کر وہیں کھڑا ہو گیا اور دل میں کہا، جب مار ہے تو مار بھی کھائیں گے۔ ہمارے ساتھیوں میں وہی لڑکا جس سے جھگڑا ہوا تھا یعنی اقتدار حسین بھاگ کر محلہ میں اس جھگڑے کی اطلاع

کردی۔ وہاں سے میرے بھائی اختر حسین، بھائی معشوق حسین،
بھائی آقا حسین اور مجتبیٰ حسین یہ چار جوان لکڑیاں لئے فوراً آگئے اور
اُدھر کی کمک پہنچ چکی تھی۔ اور مجھ سے سخت کلامی ہو رہی تھی۔ ہمارے
محلے سے آنیوالوں نے دُور سے للکارا 'خبردار!' ہم آگئے یہ دیکھتے
ہی وہ لوگ بھاگ گئے۔ کچھ دِنوں کے بعد جس لڑکے کی پٹائی کی گئی
تھی اُس نے کہلا بھیجا کہ پرشدی پور میں جب غازی میاں کے میلہ
میں اگر تم لوگ آئے تو دیکھیں گے۔ یہ چیلنج سُن کر آپس میں مشورہ
کر کے میں اور میرے ساتھ دو بھانجے (مہدی حسن و امیر حسن) اور
دو لڑکے محلے کے (زاہد حسین و سلیمان خاں) اپنی اسٹکیں لیکر
میلے میں پہونچ گئے۔ وہاں دو آدمی (ناصر علی و شمشیر) اور ساتھ
ہو لئے۔ رات کا وقت تھا میلے میں ہزاروں آدمی تھے۔ یقیناً وہ
لوگ بھی کہیں ہمارے تعاقب میں رہے ہوں گے لیکن نظر نہ آتے
تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں میں سے زاہد حسین سے کہا کہ تم تنہا میلے
سے باہر نکل کر پرشدی پور کی آبادی کی طرف چلو۔ وہ تنہا دیکھکر
ضرور مارنے کی کوشش کریں گے۔ ہم لوگ اِدھر اُدھر سے تمہارے
قریب چلتے رہیں گے۔ تم گھبرانا نہیں۔ چنانچہ اِسکیم درست نکلی۔
مخالف کے پانچ چھ آدمیوں نے دوڑ کر زاہد حسین پر حملہ کر دیا
اِدھر ہم لوگ بھی پہونچ گئے اور پھر مار پیٹ خوب ہوئی۔ اُنکے
کئی آدمی زخمی ہو کر بھاگ گئے مگر اس شخص کو جس سے خاص لڑائی

تبھی بھاگنے نہیں دیا اور اِس قدر مارا کہ جب اُٹھا کر سلون ہسپتال لائے تو وہاں کے ڈاکٹر نے جواب دے دیا اور کہا کہ اِسے بریلی ہسپتال لے جاؤ۔ دوسری جانب ہم لوگ بھی بھاگ کر اپنے اپنے گھر آگئے میں نے والد صاحب کو واقعہ کی اطلاع دی۔ انھوں نے کہا 'خیر چونکہ مار کر آئے ہو اس لئے مقدمہ لڑیں گے اگر مار کھا کر آئے ہوتے تو ہرگز مقدمہ نہ لڑتے۔ رائے بریلی میں ہم لوگوں پر مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ پہلی پیشی کے بعد ہم چار یا پانچ لڑکے نکال دیئے گئے اور عدالت نے کہا 'یہ نابالغ ہیں ان پر مقدمہ نہیں چل سکتا۔ صرف دو آدمی باقی رہے یعنی ناصر علی اور مُشیر۔ غرض سال دو سال مقدمہ چلتا رہا۔ ہماری جانب سے ایک عورت جو چمار قوم کی تھی اور مصطفےٰ خاں سے عقد کر کے مسلمان ہو چکی تھی اُس کو پیش کر کے یہ بیان دِلوایا گیا کہ میلے میں میں بھی گئی تھی اور اِن لوگوں سے میرا جھگڑا ہو گیا میں نے اِمداد کے لئے پکارا، بہت سے آدمی میری مدد کو دوڑ کر آگئے اور اُن لوگوں سے اِن کی مار پیٹ ہونے لگی۔ میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ اس عورت سے عدالت نے شناخت کروائی کہ یہ لوگ تو نہ تھے۔ اس نے کہا یہ نہیں تھے' وہ دوسرے لوگ تھے رات کا وقت تھا اور میں بھی اپنی جان بچا کر بھاگی یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کون لوگ تھے۔ مخالف وکیل نے بڑی جرح کی لیکن اُس کے بیان میں شک کی گنجائش نہ پیدا کر سکے۔ بالآخر مقدمہ

ثابت نہ ہو سکا اور خارج کر دیا گیا۔ اسی سال میں نے مڈل کلاس کا امتحان دیا۔ اور چھٹیوں کا زمانہ تھا، میں اپنے خالو سید اولاد علی عرف جھگو میاں کے یہاں قصبہ ایرایاں سادات ضلع فتحپور ہسوہ گیا ہوا تھا انھیں دنوں مڈل کلاس کا نتیجہ نکلا۔ اور گزٹ چھپ کر مشتہر ہوا۔ ایک صاحب خالو جان کے گھر آئے اور مجھ سے کہا، افسوس ہے کہ تم فیل ہو گئے۔ یہ سنکر مجھے بڑا رنج ہوا، کچھ دیر تو سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بالآخر میں نے انسے کہا مجھے کسی طرح یقین نہیں ہوتا کہ میں فیل ہو گیا ہوں تو پھر سلون کے مڈل اسکول سے کوئی بھی پاس نہیں ہوا ہوگا۔ انھوں نے کہا اس قدر یقین اور بھروسے کے ساتھ کہہ رہے ہو۔ میں نے پھر کہا یقیناً آپ گزٹ لے آئیں اور میرے سامنے پڑھیں۔ وہ صاحب گئے اور گزٹ لے کر آئے۔ میں تو انگریزی اس وقت اتنی نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی ان کے پڑھنے پر میں نے کہا، بھائی ان ناموں میں تو میرے سلون کے کسی لڑکے کا نام نہیں ہے۔ آپ کہاں سے پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے دکھلایا کہ یہ دیکھو۔ سلون ریڈنگ لکھی ہوئی ہے۔ (در اصل غلطی یہ تھی کہ سلون کے علاوہ ایک اور قصبہ تھا ستاؤن، یہ صحیح معنوں میں ستاؤن لکھا تھا (SAT ON) لیکن سلون میں بھی یہی حروف آتے ہیں فرق یہ تھا کہ ستاؤن (Saton) کی "ٹی" (ٹ) کٹی ہوئی نہ تھی اس لئے وہ بھی "ل" (ایل) پڑھی جاتی تھی

انھوں نے پھر دوسرا صفحہ الٹا تو دوسری ہیڈنگ سکون نظر
آئی۔ اُس میں نام دیکھے تو میرے اسکول کے لڑکوں کے نام
اور شروع ہی میں میرا نام بھی سکنڈ ڈویژن میں موجود تھا۔
لوگ خوش ہو گئے اور میرے یقین و اطمینان کی بڑی تعریف
الغرض اب میرا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول رائے بریلی میں کرا دیا
اور انگریزی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران اب "ہاکی" کے
کھیل میں بھی نمایاں شہرت حاصل ہو گئی۔ میں گورنمنٹ
اسکول "اے" ٹیم میں لے لیا گیا اور شہر میں اسپورٹ کلب
بھی ممبر بن گیا۔ اب تو کھیل میں اس قدر ترقی کی کہ رائے بریلی ضلع
کے انتخاب میں بھی آ گیا۔ ایک سال ضلع بارہ بنکی میں رہا تھا تو وہاں
بھی ضلع کی منتخب ٹیم میں کھیلا۔ ایک سال ضلع سلطان پور میں چچا
کے پاس رہا تو وہاں ضلع کے اندر شہرت حاصل کی۔ غرضکہ اب
جگہ ٹورنامنٹ میں کسی نہ کسی ٹیم کے ساتھ منتخب ہو کر جاتا رہا۔ لکھنو
فیض آباد۔ سلطان پور۔ الہ آباد۔ بارہ بنکی۔ گورکھپور۔ ضلع بستی۔
نینی تال وغیرہ مقامات پر کھیلنے کا موقع ملا اور کافی شہرت ملی۔
رائے بریلی میں چندر اپور ٹورنامنٹ۔ لکھنؤ میں رام لعل کپ وغیرہ میں
کھیلنے کے متعدد مواقع ملے۔ چندر اپور ہاکی ٹورنامنٹ میں میری
ٹیم داخل تھی اور عوام کا یہ خیال تھا کہ فائنل میں میری ٹیم اور دوسری
جو اُوناؤ اور کانپور سے منتخب ہو کر آئی تھی یہی دونوں ٹیمیں فائنل

کھیلیں گی۔ لیکن عجب اتفاق کہ ٹائیز ڈرا ہونے پر انھیں سے
دونوں ٹیموں کا پہلا میچ نکلا۔ کھیل کے موقع پر اس قدر مجمع تھا کہ
لوگوں کو جگہ نہ ملنے کے سبب بہت سے درختوں پر چڑھے ہوئے
تھے کھیل بہت زوردار ہوا مگر جب میری جانب سے کوئی گول ہوا
تو فوراً دوسری طرف سے ادا کیا گیا۔ غرض فاضل وقت دے کر ڈیڑھ
گھنٹہ کھلایا گیا لیکن فیصلہ نہ ہوسکا۔ اب مسلسل تین دِن روزانہ ڈیڑھ
ڈیڑھ گھنٹہ کھلاتے رہے، فیصلہ نہیں ہوا بالآخر تیسرے دِن دوسری
جانب کی ٹیم نے رَش گیم شروع کردیا۔ میں نے اپنی ٹیم سے کہا تم لوگ
رَش نہ ہونا آج یقیناً ہم جیتیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا جب دو گول کی
سبقت حاصل کرلی۔ اور دس منٹ صرف باقی رہ گئے تب ہم
لوگوں نے بھی جوابی کارروائی شروع کردی نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ٹیم جیت
گئی مگر دونوں ٹیموں کے متعدد کھلاڑی زخمی ہوگئے۔ اور دوسرے
روز سکنڈ راؤنڈ میں معمولی ٹیم جو آرام کررہی تھی اُس نے بآسانی میری
ٹیم کو شکست دے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِن دونوں ٹیموں کے کٹ
جانے کے بعد معمولی ٹیمیں فائنل میں کھیلیں۔ کھیل کے دَوران
چچا مظہر حسین صاحب نے کہہ دیا کہ میں اِنعام دوں گا لیکن میرے
روپے واپس کردینا۔ ایسا ہی ہوا، کھیل میں اُنھوں نے اِعلان
کیا کہ فی گول دس روپے دونگا۔ میں اُس وقت بہت فارم میں
تھا، جاکر گول مارا فوراً دَوڑ کر فیلڈ میں آگئے، اور دس روپے کا

نوٹ جیب میں ڈال دیا۔ دیکھا دیکھی بہت سے لوگوں نے روپے دیئے جو سب میرے ہو گئے اور چچا منظر حسین کا نوٹ اُن کو بعد میں واپس کر دیا۔

چچا سید مظفر حسین صاحب جو سرکل انسپکٹر پولیس تھے وہ تبدیل ہو کر سلطان پور آ گئے تھے۔ اِس لیئے میں نے اِنھیں کے پاس رہ کر سلطان پور سے میٹرک پاس کیا، اِمتحان کا سنٹر فیض آباد میں تھا اب اِس کے بعد لکھنؤ میں مجبوراً داخلہ آرٹ سائیڈ میں شیعہ کالج میں لے لیا، کیونکہ میں نے میٹرک سائنس کیساتھ کیا تھا لیکن سائنس میں داخلہ نہ لکھنؤ میں مل سکا اور نہ الہ آباد میں۔ یہاں بھی میرے ہاکی کے کھیل کا شباب رہا۔ کالج کی "اِلیون" ٹیم میں بھی کھیلتا تھا اور شہر میں نذیر آباد میں کرایہ کے مکان میں قیام تھا نہنداؤں سے قریب منکی برج پر ایک جانب رووَرس کلب میں کھیلتا تھا۔ جس کے کپتان مسٹر جین تھے جو فل بیک کھیلتے تھے اور پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔ برج کے دوسری طرف بنگال بنگ مین ٹیم کھیلتی تھی اُس کے کپتان مسٹر ہابل تھے۔ میں رووَرس کلب میں کھیلنے لگا۔ اِس دَوران بھی بہت سے ٹورنامنٹ کے لئے ابھی تک ملکی ٹیموں کا رَواج نہ تھا۔ صرف پہلا موقع تھا اور یہ ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا جبکہ اُولمپک ٹیم کا اِنتخاب کیا گیا۔ میں نے مقابلہ میں حصّہ لیا اور نتیجہ میں

لکھنؤ کمشنری کے انتخاب میں آگیا۔ پھر تمام کمشنریوں کا مقابلہ ہوا تاکہ اَوَدھ صوبے کی ٹیم بنائی جائے۔ میری پوزیشن پر دوسرا لڑکا جس کا نام ھِیَرا تھا اور وہ فیض آباد کمشنری کا نمائندہ تھا وہ منتخب ہو گیا۔ ویسے اَوَدھ کی ٹیم سے دُو نامی کھلاڑی دِھیان چند اور رُوپ سنگھ لئے گئے لیکن جب تمام صوبوں کا مقابلہ کلکتہ میں ہوا تو ھِیَرا کٹ گیا اور اب انڈیا کی ٹیم میں اس پوزیشن پر پنجاب کا کھلاڑی لیا گیا۔ یہ میرے ہاکی کھیل کے شباب کا آخری زمانہ تھا۔ اس کے بعد میں نے شیعہ کالج لکھنؤ سے "ایف اے" کے آخری امتحان میں فیل ہونے کے سبب پڑھائی چھوڑ دی اور جب تک ہندوستان میں رہا "ہاکی" حالانکہ میرا اب کھیل زوال پذیر ہو گیا تھا مگر پرانے ساتھی چھوڑتے نہ تھے اور زبردستی برابر میچز اور ٹورنامنٹ میں کھلاتے رہے۔ چونکہ والد صاحب کا بڑا اثر رسوخ تھا۔ اِس لئے گھر میں بارہ بور بندوق، ایک نالی۔ ڈو نالی بھی موجود تھی۔ اور بارود بھر کر چلانے والی بندوق بھی تھی۔ ایک رائفل تھری اسپرنگ فیلڈ تھی۔ اور ایک ریوالور جس کے چیمبر میں بہ یک وقت نو کارتوس لگتے تھے وہ بھی موجود تھا۔ ان جملہ ساز و سامان کے سبب بچپن سے بندوق چلانے اور نشانہ بازی کا شوق رہا۔ اپنے یہاں شکار دو میں صرف ہرن یا نیل گائے تھی۔ دریائی شکاروں میں آبی بطخیں۔

سیخ پر اور مرغابی وغیرہ تھے۔ باغات کے شکاروں میں مور ہارِل یا ہریل وغیرہ تھے لیکن بڑے بھائی اختر حسین صاحب ضلع بہرائچ میں تقریباً بارہ ۱۲ سال سب انسپکٹر پولیس رہے اور ہر تھانے میں عرصہ تک کام کیا۔ وہاں گورنمنٹ فارسٹ تھے۔ جو نیپال کے جنگلات سے ملے ہوئے تھے۔ یہاں سانبھر۔ بارھا بارہ سنگھا۔ شیر۔ چیتے۔ تیندوے۔ لکڑ بگھا اور جنگلی سور کی انتہا نہ تھی۔ لہٰذا جب موقع ملتا، تعلیمی زمانے میں یا اسکے بعد اکثر بھائی صاحب کے پاس بہرائچ چلا جاتا اور جنگلات میں شکار کھیلتا کئی مرتبہ دلچسپ واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کو ذیل میں مختصراً لکھتا ہوں:-

(۱) ایک شام کو بہرائچ میں جنگل کی جانب بیل گاڑی جسکو اَدّھا کہا جاتا ہے پر سوار ہو کر ہم لوگ شکار کو روانہ ہوئے تاکہ رات میں ٹارچ کے ذریعہ شکار کا لطف حاصل کریں۔ ہمراہ میرے بڑے بھائی اختر حسین اور ان کے ایک دوست بشیر صاحب شکار کیلئے چلے۔ گاڑی بان خود ایک شکاری جس کا نام غفور تھا۔ ابھی تو مغرب کا وقت ہوا تھا جنگل کے کنارے پہونچے تھے کہ دیکھا ایک بہت بڑا نامی تیندوہ جو قریب شیر کے برابر تھا، وہ ایک درخت کے تنے کے قریب بیٹھا ہوا ہم لوگوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ بھائی صاحب نے گاڑی رکوائی اور اس پر گولی چلا دی۔

(۲) ایک شب ہم لوگ شکار کھیل کر واپس ہو رہے تھے شکار میں کئی چیتل اور سانبھر وغیرہ مار لئے تھے۔ گاڑی روک دی گئی۔ جنگل میں جو چشمہ بہہ رہا تھا اس کی جانب الگ الگ سارے شکاری رفع حاجت کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں جس جانب جا رہا تھا۔ کچھ جنگلی مرغ بانگ دے رہے تھے۔ بڑا شکار ہو چکا تھا لیکن خیال ہوا کہ مرغ مار لیں۔ بندوق کھولکر گولی کا کارتوس نکالا اور چھرے کا کارتوس لگا لیا۔ جھاڑیوں میں جھکے جھکے مرغ کی تلاش میں جا رہے تھے کہ موقع ملے تو شکار کر لیں لیکن وہ مرغ جھاڑیوں میں بھاگ رہے تھے اور کسی طرح موقع نہ دیتے تھے میں ان کے تعاقب میں بالکل اپنے دائیں بائیں اور سامنے سے غافل تھا، یکایک ایک بہت بڑے تیندوے پر نظر پڑ گئی تقریباً بیس گز کے فاصلے پر بیٹھا ہوا میری طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ بس اس پر نظر پڑنی تھی کہ تمام جسم پسینے سے تر ہو گیا مگر حواس درست رہے فوراً بندوق کھول کر دونوں نالوں میں گولی کے کارتوس لگائے اور بندوق کو سینے پر لگا کر اس کی لبلبی پر انگلی رکھ دی مگر فیر نہیں کیا کیونکہ آمنے سامنے برابر پر موجود تھے یہ فیر خطرہ سے خالی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے بندوق سینے پر رکھے الٹے پاؤں قریب چالیس گز تک پلٹ گئے وہ برابر بیٹھا دیکھتا رہا۔ میرا خیال یہ رہا کہ اگر دیکھوں گا کہ وہ اٹھتا ہے اور حملہ کا قصد کرتا ہے تب فیر

کر دوں گا۔ جب وہ نہ اٹھا تو میں نے کافی دور پلٹ کر سیٹی بجائی۔ تمام شکاری دوڑ کر آگئے۔ میں نے حال بتلایا، بھائی صاحب نے کہا چلو چل کر ماریں گے۔ اب ہم سب بالکل تیار ہو کر بڑھے لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر غائب ہو چکا تھا اور کہیں آس پاس نظر نہ آیا۔

(۳) ایک رات، میں اور میرے ساتھ بھائی اصغر حسین اور ایک دوسرا شکاری اسی بہرائچ کے جنگل میں شکار کیلئے جا رہے تھے، ابھی بیل گاڑی جنگل میں داخل ہی ہوئی تھی کہ ایک جانب ایک خونخوار تیندوہ جھاڑی میں چھپا بیٹھا تھا جونہی گاڑی اسکے قریب پہنچی اس تیندوے نے جست لگائی اور گاڑی پر آیا مگر اس طرح کہ اس کے دونوں ہاتھ گاڑی کے پردے کی دیوار پر تھے اور اسکا جسم اور پچھلے پاؤں پہیہ اور سینجنی پر تھے۔ سارے شکاری بندوق بھری ہوئی لئے مختلف سمت، رخ کر کے بیٹھے ہوئے تھے جس طرف اسکا حملہ ہوا ادھر بھائی اصغر حسین تھے۔ گاڑی پر آتے ہی خود بخود خوف کے عالم میں بھائی اصغر حسین نے بندوق کی نالی اس کے سینے پر لگا دی۔ خدا جانے کیسے انگلی بھی کام کر گئی اور بندوق سے فیر ہوا۔ گولی نے اسے اٹھا کر دس گز پیچھے پھینک دیا۔ حالانکہ اب اس میں جان باقی نہ تھی مگر خوف کی وجہ سے ہم لوگوں نے اس پر گولیوں کی بوچھار کر دی لیکن اس طرح ہاتھ پیر

کانپ رہے تھے کہ چودہ فیر کئے گئے لیکن صرف ایک گولی اُسے لگی۔ باقی گولیوں نے زمین سے گرد و غبار اُڑا دیا اور جھاڑیوں پر چھپ کر نکل گیا۔

(۴) ایک انگریز آفیسر کا شیر کا شکار :- ایک کوئی انگریز افسر تھا وہ معہ اپنی میم صاحب کے شیر کے شکار کیلئے بہرائچ آیا۔ بھائی صاحب جو یہاں سب انسپکٹر پولیس تھے۔ شکار کا بندوبست کردیا اور شکاریوں نے جنگل میں بکرے وغیرہ باندھ کر شیر کا پتہ کرالیا۔ جب وہ شیر اپنا شکار کر گیا تب اُس مقام پر جو کئی درختوں پر مچان باندھ دیئے گئے جن پر شکاری بیٹھ گئے اور دوبارہ وہاں ایک بکرا پھر باندھ دیا گیا اور اُسے مارنے لگا۔ تاکہ وہ چلائے اور اُس آواز پر شیر آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور شیر وہاں آپہونچا اُس انگریز کی میم صاحبہ نے اُس پر فیر کیا وہ زخمی ہوا اور جست لگا کر مچان پر آیا اور اس کے نچلے حصّہ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر نیچے کی شاخ پر لٹک گیا۔ اُس میم نے رائفل کی نال اس کے منھ میں لگادی جسے وہ چبانے لگا تو اس میم کے پاس جو شکاری بیٹھا تھا اور کارتوسوں کی پیٹی لئے ہوئے تھا وہ فوراً نیچے کی شاخ پر چلا گیا۔ میم بار بار کہتی رہی ول کارتوس، ول کارتوس، لیکن شکاری صاحب کی جان پر بنی تھی۔ کارتوس کون دے۔ بالآخر اس شکاری نے مجبور ہو کر جھک کے پیٹی سے کارتوس نکالا۔ اور رائفل میں لگا کر فیر کردیا۔ رائفل تو اُس شیر کے منھ میں تھی وہ

فوراً نیچے گر کر ہلاک ہو گیا۔ بعد میں میم صاحب کہنے لگیں ویل شکاری تم نے تو ہمیں آج مروا ڈالا تھا۔ شکاری نے جواب دیا: میں نے تو آپ کی جان بچا دی اور آپ کہتی ہیں کہ مروا ڈالا۔ وہ پھر بولیں تم نے کس طرح جان بچا دی۔ شکاری بولا کہ میں نیچے کی شاخ پر ہو گیا تھا۔ اور شیر کی ٹانگیں پکڑے ہوئے تھا ورنہ وہ ضرور مچان پر آکر آپ کو نقصان پہونچا دیتا۔ میں نے اس طرح اپنی جان پر کھیل کر آپ کی جان بچا لی۔

(۵) ایک مرتبہ ہم اپنے موضع گوپال پور سے العیہاری کے میدانمیں ہرن کا شکار کرنے گئے۔ وہاں عجیب اتفاق ہوا کہ تین ہرن نظر آئے۔ اور تینوں کو پانچ منٹ کے اندر مار کر گاڑی میں لیکر واپس آئے۔ ہوا یہ کہ جیسے ہی ہم میدان میں پہونچے، دیکھا تین ہرن کھلے میدان میں ایک جگہ کھڑے ہیں۔ گاڑی رکوائی۔ ایک بندوق میرے ہاتھ میں اور دوسری میرے ملازم موسیٰ خاں کے ہاتھ میں تھی۔ گاڑی پر چار۔ پانچ شکاری اور بھی تھے مشورہ یہ ہوا کہ بہت دور سے بیٹھے بیٹھے ایک جانب میں پانی کے نالے میں بندوق لیکر بیٹھ جاؤں۔ دوسری جانب موسیٰ خاں (ملازم) پانی کے نالے میں بیٹھ جائے۔ اور باقی شکاری دو دو بٹے کر کے دائیں اور بائیں جانب سر جھکائے راہگیر کی طرح راہ چلتے رہیں۔ یقیناً ہرن انکو دیکھ کر کسی جانب بڑھیں گے۔ خواہ وہ میری طرف آویں یا

موسیٰ خاں (ملازم) کی طرف جائیں۔ پروگرام بالکل درست نکلا۔ وہ ہرن موسیٰ خاں کی طرف بڑھے، جیسے ہی رینج میں آئے اور اس طرح کہ دو ہرن ایک لائن میں ہوئے، موسیٰ خاں نے فیر کیا، ایک ہرن اسی جگہ گر گیا اور دوسرا زخمی ہو کر لنگڑاتا ہوا میری جانب بھاگا تیسرا جو درست حالت میں تھا اُسنے نہایت تیزی سے چھلانگ لگائی اور میری طرف کا رُخ کیا۔ جونہی اس نے نالے پر چھلانگ لگائی میں نے فلائنگ شاٹ کر دیا، وہ کئی قلابازی کھا کر وہیں گر گیا۔ اُدھر ایک کو موسیٰ خاں نے دوڑ کر ذبح کر لیا۔ اور دوسرے کو میں نے ذبح کر دیا۔ اور وہ زخمی ہرن جو باقی رہ گیا۔ تھوڑی دور دوڑ کر اُس پر ایک اور فیر کر دیا اس طرح تینوں ہرن مار کر گاڑی میں ڈالے اور واپس ہوگئے۔

(۶) اسی میدان میں الیہاری کے، ایک دن شام کے وقت ایک ہرن کو دیکھا، حالانکہ اس میدان میں ہرن کم ہیں، نیل گائے زیادہ۔ ہرن کو دیکھتے ہی میں نے فیر کر دیا وہ زخمی ہوا لیکن لنگڑاتا ہوا قریب کے گاؤں کی طرف بھاگا۔ اور گاؤں کے باہر ایک باغ جس میں کافی جھاڑیاں تھیں داخل ہو کر کہیں چھپ رہا۔ میرے تمام ہمراہی دور میدان میں تھے اور میں دوڑتا ہوا اس ہرن کے پیچھے باغ میں داخل ہوا تاکہ دوسرا فیر کر کے اسے مار لیں۔ لیکن جونہی میں اس باغ کے اندر پہونچا۔ اس میں

ملحق گاؤں میں نامی گرامی بدمعاش اُرجن سنگھ رہتا تھا، وہ لاٹھی لیے ہوئے باغ میں میرے پاس پہونچا اور کہتا ہوا کہ تم نے نیل گائے ماری ہے ہم ابھی تمہاری بندوق چھین لیں گے۔ میں کہتا رہا، بھائی میں نے ہرن مارا ہے۔ وہ یہیں کہیں زخمی ہوکر جھاڑیوں میں چھپ گیا ہے۔ وہ کہنے لگا یہاں ہرن ورن کہاں ہیں؟ تم نے نیل گائے ماری ہے میں ابھی تمہاری یہ بندوق چھینے لیتا ہوں جب وہ کسی طرح نہ مانا اور اسقدر قریب آگیا کہ اب جھپٹ کر ڈنڈے سے حملہ کر دے۔ تب میں نے تیور بدل کر بندوق سینے پر لگالی اور لبلبی پر انگلی ڈال کر کہا، خبردار اب اگر تم نے ایک قدم بڑھایا تو ابھی مار کر یہیں جھاڑیوں میں ڈالدیں گے۔ رات بھر میں سیار و گیدڑ کھا جائینگے کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ بس اب تو زمین نے اُس کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور وہ کہنے لگا آپ کون ہیں؟ آپ کا کیا نام ہے؟ میں نے کہا اب نام بتانے سے کیا فائدہ۔ تم بندوق چھینو، ہم بھی دیکھتے ہیں کہ تم کس طرح بندوق لے سکتے ہو۔ اب اس نے کہا، آپ نہیں جانتے کہ ہم ارجن سنگھ ہیں۔ میں بولا: اچھا میں نے نام سُنا تھا، آج دیکھ بھی لیا کہ تم کتنے بہادر ہو۔ اب جب تم نے نام بتا دیا ہے تو میں بھی بتاتا ہوں کہ میں قاضی سید محمد حسین آنریری مجسٹریٹ گوپال پور کا بیٹا ہوں۔ بس یہ سنتے ہی وہ کہنے لگا کہ

ارے حضور آپ تو ہمارے مالک ہیں۔ ہم سمجھے تھے کہ بکسرائکیں کے لوگ شکار میں آئے ہیں۔ حضور آپ ہمارے گھر چلیں شربت پئیں۔ میں نے خیال کیا یہ بھی بدمعاش کی چال ہے۔ میں نے کہا، بھئی اب تو شام ہوگئی ہے۔ پھر کبھی آئیں گے شکار کو تو ضرور تمہارے گھر پر آکر ملیں گے۔ اس نے کہا ضرور ضرور آئیے اور نیل گائے کا شکار کیجئے، ہماری گاڑی پر لاد کر لے جائیے۔ وعدہ ہوگیا اس وقت تو میں واپس چلا آیا، دوسرے دن اس زخمی ہرن کو ڈھونڈ کر گاؤں والوں نے کھایا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد شکار میں گیا تو اس کے گھر بھی گیا شربت وغیرہ پیا۔ موسیٰ خاں (ملازم) سے کہدیا تھا کہ تم غافل نہ رہنا۔ بندوق بھری رہے۔ اگر اس کی نیت خراب دیکھنا تو فوراً گولی مار دینا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس دن سے وہ ہمارا دوست بن گیا+

محرّم کی لڑائی

ابھی کالج میں پڑھائی کا زمانہ ہے۔ محرّم کے زمانے میں ہم لکھنؤ سے سلون آگئے۔ خود میرے امام باڑے سے تین دن (۸-۹-۱۰) محرّم کا گشت ہوتا ہے جس میں اونٹ پر روٹیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ اُدھر چودھرانہ محلّہ سے چودھری صاحبان بھی گشت کرتے ہیں اور تینوں تاریخوں میں دونوں گشت

آخر میں ایک جگہ مل جاتے ہیں۔ تقریباً چالیس پچاس ہزار کا مجمع ہوتا ہے۔ بڑے عَلَم قریب قریب پچیس پچیس دونوں طرف گشت میں رہتے ہیں اور جب دونوں گشت ملتے ہیں تو علمبردار اپنے اپنے عَلَموں کے پھریرے بھی کھول دیتے ہیں عجیب سماں رہتا ہے۔ محرّم کی ۹ تاریخ گزر کر شبِ عاشور میں گشت اٹھا اور عاشور کی صبح کو واپس آرہا ہے۔ دونوں گشت جب ملے اور جب میرا گشت جو پیچھے تھا اپنے ایک طرف نکل کر جانے کے وقت پولیس نے راستہ بنا دیا اور میری جانب کے عَلَم گزرنے لگے تو چودھریوں کی جانب سے کسی علمدار نے ایک عَلَم کو لڑا دیا اور اُس کی ڈوری اُلجھ گئی۔ بس اس بات میں جھگڑا ہو گیا اور زبردست مارپیٹ شروع ہو گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں اہلِ سنّت وَالجماعت موجود تھے اور شیعوں میں بیس ۲۰ پچیس ۲۵ نوجوان میدان میں کود گئے۔ لیکن خدا کا شکر ہے اور مَولیٰ کا کرم ہے ہماری جانب سے کوئی بوڑھا یا بچّہ بھاگ کر نہیں گیا۔ البتّہ بوڑھے اور بچّے ایک طرف کنارے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اور حیرت سے دیکھتے رہے۔ ہم لوگ اُس وقت زنجیروں کا ماتم کر رہے تھے، وہی زنجیریں لئے ہوئے میدان میں کود گئے۔ جس کے منھ پر زنجیر پڑی وہ جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی دوران میری نظر پڑ گئی کہ دو آدمی بھاگے

واحد حسین صاحب جو ضعیف العمر تھے اُن کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ بجلی کی طرح اُن کے پاس پہونچکر حملہ کیا اور واحد حسین کو بچا کر ایک طرف لا کھڑا کیا۔ پھر نظر پڑی کہ شمشاد علی جو تقریباً سات فٹ کے جوان اور بڑے مضبوط انسان تھے ان کو چھ آدمی لپٹے ہوئے ہیں۔ دو آدمی داہنا ہاتھ۔ دو آدمی بایاں ہاتھ پکڑے ہیں اور دو آدمی کمر سے لپٹے ہیں مگر ان کو گرا نہیں پاتے۔ جھپٹ کر اُن کے پاس پہونچا، حملہ کر کے اُن لوگوں سے چھڑایا جو انکو قابو کئے ہوئے تھے۔ بس اُنکا چھوٹنا تھا کہ ایک آدمی کو پکڑ کر دوسرے پر دے مارتے تھے تھوڑی دیر میں میدان خالی ہوگیا۔ اور اُن کا جو علم لڑا یا تھا وہ چھین لیا۔ اپنا تمام سامان چھوڑ کر وہ لوگ بھاگ گئے۔

اس موقع پر واکر صاحب جو دیکھ رہے تھے انکا ایک جملہ تھا "میں نے آج انور سلمہٗ کو دیکھا ہے کہ کس بھرپور انداز میں وہ حفاظت کرنا جانتے ہیں۔"

اس موقع پر سلون کے علاوہ رائے بریلی سے بھی پولیس آگئی، موقع دیکھا بیانات لئے۔ والد صاحب اور چودھری صاحبان نے کہدیا کہ ہم لوگوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ لڑائی غیر متعلقہ لوگوں میں ہوئی ہے، اس طرح معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

بہر نوع جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ بندوق کا شکار اور
ہاکی کا کھیل اپنے شباب پر تھا اس لئے پڑھائی کی طرف
کم دھیان دے رہا تھا اور "ایف اے" فائنل امتحان میں
فیل ہو گیا بزرگوں نے تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا اور کہا تمکو
کھیل سے فرصت نہیں، پڑھ لکھ کر کیا کرو گے۔ ملازمت
کر لو میں نے کہا مجھ سے غلامی نہیں ہو سکتی اور میں نوکری
نہیں کروں گا۔ والد صاحب نے کہا، گھر میں کھانے کو
ہے ملازمت نہیں کرنا چاہتے تو گھر بیٹھ کر کھاؤ۔ چنانچہ
میں نے گھر پر رہ کر زمینداری کے کام میں دلچسپی دکھائی
تو والد صاحب نے سارا کام میرے سپرد کر دیا اور خود آرام
کرنے لگے چچا مظفر حسین، والد صاحب سے بارہ سال
چھوٹے تھے اور میرے والد کو مثل باپ سمجھتے تھے۔ کبھی ان سے
زمین کا حساب نہ لیا۔ چنانچہ اس کام کو میں نے سات برس
تنہا انجام دیا۔ اس پر والد صاحب حیران تھے اور کہتے تھے تم
معجزہ کرتے ہو کیا کہ سات سال کے عرصے میں ایک مقدمہ بقایا
لگان کا نہیں دائر کیا۔ اور سال پر تمام کاشتکاران کل مطالبہ ادا
کر دیتے ہیں پہلے میرے پاس ایک سپاہی تھا۔ اب تم نے چپراسی
(شکور خاں۔ رام کمار۔ دلارے۔ برج بھوشن) گھٹا دیئے پہلے سیر کی
کاشت کے لئے چار جوڑی بیل تھے اب تم نے کاشت پر ختیم (۶)

جوڑی بیل لگا دیئے۔ علاوہ سپر کے جھیل کا پانی جب کم ہونے لگتا ہے تو تم ایک مرتبہ زمین کو جتوا کر چھینٹے اور سرسوں کے بیج ڈال دیتے ہو۔ اور اس افتادہ زمین میں تین سو من چنا پختہ (۵۶ سیر والا من) پیدا کر لیتے ہو۔ کبھی کسی رعایا کو پھول کی چھڑی نہیں ماری اور سب تمہارے مدّاح ہیں۔ کھیت کھلیان سے کہیں چوری نہیں ہوتی۔ عام اعلان کر رکھا ہے کہ کوئی رعایا بھوکا نہ سو جائے۔ اگر کھانے کو نہیں ہے تو یہاں آکر بتلائے۔ اکثر لوگ آتے تھے اور میں فوراً سپاہی کو حکم دیتا تھا کہ انہیں ایک ٹوکرہ غلہ دے دو۔ جو قرض نہ تھا بلکہ صرف بطور امداد تھا۔ وہ لے جاتے تھے۔ اور مالک کا شکر ادا کرتے تھے۔

مستقل کھیت جوتنے والے ہروا ہے اور مزدوروں کو الگ الگ بیلوں کی جوڑی سپرد کر دی تھی کہ تم خود اپنے بیلوں کے کھلانے پلانے کے ذمہ دار ہو۔ اگر تم کسی دن چھٹی کر دگے تو تمہارے بیل بھی آرام کریں گے۔ اس طرح کے انتظامات کر رکھے تھے۔ موضع میں پچاس بیگھہ زمین کا ٹکڑا ایسا تھا جس میں جھکا نسا بہت اُگتا تھا اور وہ قابل کاشت نہ تھا۔ میں نے اس پچاس بیگھہ کی چوحدی بنوائی۔ درمیان میں اتنا بڑا کنواں بنوایا کہ جس میں بیک وقت بارہ ۱۲ عدد پُر یعنی کُر لگ سکتے تھے۔ روشیں بنوادیں کیاری بندی کر کے تھالے بنوائے۔ اور پرانا قلمی باغ جو تھا وہاں سے

قلمیں بندھوائیں۔ پودے لے جاکر وہاں تھالوں میں لگوایا، قریب قریب سو ڈیڑھ سو درخت لگوا چکا تھا جب پاکستان آنا پڑا اور چونکہ ابھی تک اس باغ کا اندراج کاغذات پٹواری میں باغ کا نہ ہوا تھا اس لئے جب زمینداری ضبط کی گئی تو وہ بھی ضبطی میں آگیا اور رعایا کو نیلام کردیا گیا۔

زمینداری کے کام کے دوران سرحدی ٹھاکر زمینداروں سے جھگڑے ضرور ہوئے لیکن خدا کے فضل و کرم سے سب میں کامیابی ہوئی۔

(۱) پہلے منّی رام پور کے ٹھاکر چھوٹے سنگھ سے سرحدی جھیل پر پانی کے حاصل کرنے کے سلسلے میں جھگڑا ہوا۔ دونوں طرف سے لڑنے کیلئے لوگ آئے لیکن لڑائی نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد میں نے اُس طرف کی سرحد پر مٹی کھدوا کر کھیتوں میں ڈلوائی اور اس طرح جھیل کا تمام حصّہ اپنی جانب نشیب بن گیا اور آئندہ کے لئے ٹھاکر چھوٹے سنگھ جھیل کے پانی سے محروم ہوگئے۔ صرف بارش کے زمانے میں جب پوری طرح جھیل بھری رہتی تھی تب انھیں پانی مل سکتا تھا لیکن بعد میں جب پانی کم ہوجاتا تو سب میری جانب نشیب میں رہتا تھا۔

(۲) اُرکھا کے تعلقہ دار ٹھاکر جدناتھ سنگھ کا موضع مریانے میرے موضع گوپال پور کی سرحد سے ملا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ جب جھیل کا پانی کم ہوگیا تو اُس میں کی مچھلی انھوں نے مچھیروں کے

ہاتھ نیلام کر دی۔ میں نے آدمی بھیجکر کہلایا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ نے نیلام کر دیا، یا میں خود کر دیتا۔ بہر حال چونکہ نصف نصف ہے اس لئے نصف رقم مجھے بھیج دیجئے۔ انھوں نے رقم تو بھیجی مگر جواب میں کہا، اب تو پانی میری سرحد میں ہے۔ میں نے پھر کہلایا اگر یہ بات ہے تو پھر اس میں مچھلی کا شکار نہیں ہو سکتا جب تک درخواست دے کر حد بندی نہ کرا لی جائے اور پتھر نہ نصب ہو جائیں۔ ایک دن خبر ملی کہ پچیس تیس ٹھاکر لاٹھیاں لے کر جھیل پر آ گئے ہیں اور مچھیروں کو ساتھ لائے ہیں کہ ان کی نگرانی میں مچھلی کا شکار کریں۔ میں نے اپنے چاروں سپاہیوں کو روانہ کیا اور کہا کہ تم لوگ گھاٹ پر چلو۔ ابھی جھگڑا نہ کرنا، کیونکہ تم صرف چار آدمی ہو اور وہ پوری جمعیت سے تیار ہو کر آئے ہیں۔ ابھی انھیں باتوں میں لگائے رکھو۔ گھنٹہ۔ آدھا گھنٹہ کا وقت گزارو۔ میں آتا ہوں۔ وہ سپاہی اُدھر گئے۔ اِدھر نقو عیدی جو میرے گھوڑے کا سائیس تھا اُسے حکم دیا کہ فوراً زین کس کر بیٹھ جاؤ اور گھوڑے کو دوڑا کر مہابر کا پورہ، گنگیرہ، گلاس گنج، قمر علی کا پورہ وغیرہ میں اعلان کر دو کہ دوسرے ساتھیوں کا انتظار کئے بغیر جتنے آدمی موجود ہیں وہ لاٹھیاں لیکر فوراً موضع گوپال پورہ پہنچ جائیں۔ اِدھر گوپال پور کے لوگ بھی سب نکل پڑے۔ آدھا گھنٹہ میں قریب قریب دو ڈھائی سو آدمی آگئے اب میں گھوڑے پر بیٹھا اور سب میرے ساتھ چلے، جیسے ہی جھیل پر

پہونچے سب نے بلند آواز سے "بجے" کا نعرہ لگایا۔ لاٹھیاں لیے ہوئے سب جھیل کی طرف بڑھے اُن ٹھاکروں نے جب دیکھا کہ اِدھر دو ڈیڑھ سو آدمی آ رہے ہیں تو وہ بھاگے۔ میں نے کہلا بھیجا کہ میرا مطالبہ اب بھی نصف کا ہے۔ میں لڑنا نہیں چاہتا چونکہ تم لوگ تیار ہو کر آئے تھے اس لیے میں بھی تیار ہو کر آ گیا۔ اگر لڑو گے تو ہم بھی ہرگز پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ بہرحال وہ لوگ واپس چلے گئے۔ اور میں نے اپنے تمام لوگوں کو حکم دے دیا کہ سب مچھلی کا شکار کے لیجاؤ مفت ہے۔ چند گھنٹوں میں ساری جھیل صاف ہو گئی۔ اور مچھلیوں کی بدبوئے سارا گاؤں بدبو کرنے لگا۔ پھر اس وقت سے سات برس تک جب تک میں وہاں رہا پھر ٹھاکروں کا قبضہ جھیل سے اٹھ گیا اور کل پر میرا قبضہ ہو گیا +

(۳) گوکنا گھاٹ جو دریائے گنگا پر ہے، وہاں کے ٹھاکر جو خود چار بھائی تھے، میرا جزوی حصہ موضع میں دبائے ہوئے تھے باوجود مقدمہ لڑنے کے والد صاحب کو کبھی ایک پیسہ نہیں دیا۔ میں نے دعویٰ کر کے مبلغ ڈیڑھ سو روپے کی ڈگری کرائی اور قرقی نکلوائی۔ جب قرق امین صاحب معہ اپنے عملہ کے گوپالپور آئے تو مجھ سے کہا، بھائی کس کی قرقی نکلوائی ابھی ایک مہینہ ہوا۔ راناصاحب کھجور گاؤں کی قرقی لے کر میں انھیں کے گھر گیا تھا، ان لوگوں نے ڈنڈا لیکر رانا صاحب کھجور گاؤں کے سپاہیوں کو مار بھگایا

اور ہم لوگ بھی جان بچا کر بھاگ آئے ۔ میں نے جواب دیا ٹھیک ہے ۔ وہ رانا صاحب کھجور گاؤں تھے، اور یہ میں ہوں ۔ آپ چلیئے دیکھتا ہوں آج کیسے وہ ہمارے آدمیوں کو بھگا دیتے ہیں اب میں گھوڑے پر بیٹھا ۔ کارتوسوں کی پیٹی لگائی ۔ ریوالور میں نو کارتوس لگائے ۔ اپنے مستقل چار سپاہی ساتھ لئے مزید کوئی بیس آدمی دوسرے اچھے لڑنے والے بھی ہمراہ لئے ۔ اور مکان پر پہونچکر گھیرا ڈال دیا ۔ یہ موضع میرے گوپال پور موضع سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے ۔ وہ چاروں بھائی جو اندر سے دروازہ بند کئے تھے ۔ ڈیوڑھی میں آئے اور پکار کر کہا کہاں آئے ہو ۔ ابھی گنگا میں مار کر پھینک دیں گے ۔ اِدھر ہمارے سپاہیوں نے للکارا، ٹھاکر صاحب باہر تو نکلو دیکھتے ہیں کہ آج کون کیسے مار کر گنگا میں ڈالتا ہے ۔

وہ ٹھاکر باہر نکلے، اِدھر ہمارے آدمیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور کہا خبردار بیٹھے رہو ورنہ ابھی جان سے مار دینگے وہ بیٹھے رہے اور گھر کی جھاڑو تک قرق کر لی گئی ۔ اسکے بعد اُن کا کھلیان قرق کیا گیا ۔ تمام سامان تو قرق امین نے مجھے سپرد کر دیا ۔ لیکن کھلیان کے لئے مجھے نگرانی کیواسطے آپ نے، چاروں سپاہی اور ان کے ساتھ دو اور آدمی مقرر کئے کہ تم لوگ مہینہ ڈیڑھ مہینہ جب تک نیلام کی تاریخ نہ آئے اس کی

نگرانی کرو اور برابر مجھے اطلاع دیتے رہو اگر کوئی خدشہ ہو تو میں تمہاری مدد کے لیے اور آدمی بھیجوں گا۔ بہرحال نگرانی ہوتی رہی۔ ٹھاکر صاحب کی ہمت نہیں ہو سکی کہ کچھ کریں تاریخ نیلام پر ہم نے سینکڑوں آدمی ساتھ لے جاکر ڈنڈے مار مار کر غلہ الگ کر لیا اور سب غلہ بہت ہی قلیل رقم پر نیلام کرا دیا۔ اس کے بعد سات برس تک ہر سال تین دن گنگا اشنان کے میلہ میں۔ میرا کیمپ لگ جاتا تھا اور میرے سپاہی تمام دکانوں سے آگاہی لیتے تھے۔ نقدی میں لے لیتا تھا اور مٹھائی۔ لائی۔ گڑ۔ گنا وغیرہ۔ چھالیہ۔ کتھا۔ تمباکو سب ہمارے آدمیوں کے لئے تھیں۔ جب تک وہاں میں رہا والد صاحب نے گوکنا گھاٹ کا ایک پیسہ تک نہیں لیا۔ کہتے تھے یہ تو تم نے قبضہ کیا ہے۔ مجھے تو یہ لوگ دیتے ہی نہ تھے۔ اب میں یہ نہ لوں گا۔ نقدی جس قدر وصول ہو کر آتی تھی اس میں سے بھی ہم اپنے سپاہیوں کو دے دیتے تھے کہ تمہارا صافہ ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارا انگوچھا ٹھیک نہیں ہے دوسرا نیا خرید لاؤ۔ اُسی زمانے کے چند اور اہم کام ہیں مثلاً :-

(۱) **گھوڑے کی سواری** :- میں نے تنخواہ کے مبلغ سے ایک نیا گھوڑا، جو سُرنگ پنج کلیان تھا خرید کر منگوایا۔ اور اُسے چال سکھانے کے لئے ایک تجربہ کار سوار کو بلوا کر تین چار

مہینے ٹریننگ دلوائی ۔ وہ سوار صبح کو خود گھوڑے کو لے کر میدان میں جاتا تھا اور اسے مختلف چالوں پر لگاتا تھا لیکن اُس کا کہنا یہ تھا کہ جب تک آپ نہ سواری سیکھ لیں اِس گھوڑے کی سواری اور ٹریننگ بیکار ہے یہ سب بھول جائے گا ۔ اس لئے شام کو وہ مجھے ساتھ لے جاتا اور حکم دے کر مختلف چالوں پر گھوڑے کو چلانے کے لئے کہتا ۔ غرض کہ اچھی طرح مجھے ٹریننگ دے کر وہ سوار واپس ہوگیا۔

اَب اِس گھوڑے کی یہ حالت تھی کہ بے حد مجھ سے محبّت کرتا تھا۔ جب مَیں اُس کے پاس جاتا تو وہ میرا ہاتھ یا کپڑا مُنہ میں دبا لیتا ۔ کہیں جا رہے ہیں اور راستہ میں کسی خاص شخص سے ملاقات ہوگئی مَیں گھوڑے سے اُتر کر پیدل اُس آدمی کیساتھ باتیں کرتا ہوا جا رہا ہوں اور یہ گھوڑا پلے ہوئے کُتّے کی مانند پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے اُس کے یہاں پہونچکر اندر بیٹھ کر باتیں کرتے اُسے یوں ہی باہر بغیر باندھے ہوئے چھوڑ دیا۔ وہ دروازے پر کھڑا رہے گا، جب واپس آؤں گا دیکھ کر خوشی میں ہنہنانے لگے گا ۔

اصغر بھائی کا لڑکا زائر سلّمہٗ گوپال پور سے مصطفٰے آباد پڑھنے کیلئے جاتا تھا اُسے بٹھلا کر سائیس ساتھ جاتا تھا، یہ گھوڑا بچّے کو بڑے آرام سے آہستہ آہستہ لے کر جاتا ۔ اور جب وہ سوار

ہوتا تو پیروں میں لپٹ کر گردن پکڑ کر کس طرح چڑھنے کی کوشش کرتا۔ وہ خاموش کھڑا رہتا۔ والد صاحب سوار ہو کر جاتے تو آہستہ لے کر جاتا۔ ادھر میں سوار ہونے کیلئے آیا پیٹھ پر ہاتھ مارا فوراً چاروں پاؤں پھیلا کر بہت نیچا ہو جاتا اور ادھر میں نے رکاب پر پیر رکھا اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ لوگ تماشہ دیکھتے تھے۔ اکثر سوار ہو کر، نیل گائے کے شکار کو لے جاتا اور نیل گائے کو دیکھ کر اُسے دوڑا دیتا۔ پھر وہ نالہ و خندق وغیرہ کو جست کرتا ہوا بالکل نیل گائے سے ملا دیتا کہ میں اُس کی پیٹھ پر بندوق لگا کر فیر کر دوں۔ جب میں مرہانی کی سرحد پر ...... ٹھاکروں سے لڑنے کے لئے گیا جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اور سینکڑوں آدمی میرے ساتھ تھے۔ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ آج میدانِ جنگ ہے لہٰذا کنوتیاں بدلتا اور نتھنوں سے آوازیں نکال منہ زوری کر رہا تھا کہ مجھے چھوڑ دو تو ابھی اِن سبھوں کو روند ڈالوں۔ میں نے اُس گھوڑے پر بیٹھ کر اپنی تصویر موضع گوپال پور میں قلمی باغ کے سامنے کھنچوائی تھی جو میرے پاس محفوظ ہے۔

(۲) پہلوانی کا شوق :۔ میں نے گوپال پور میں بہت بڑا اکھاڑہ بنوا لیا تھا، اپنے نجی آدمیوں کو خواہ ملازمین ہوں یا رعایا، میں نے بیسیوں آدمی کو زور آزمائی کی اجازت دے رکھی

تھی۔ ایک نٹ قوم کا نامی پہلوان بُلوا لیا تھا، جسے تنخواہ دیتا تھا فصل پر میرے کھلیان سے دیگر رعایا کی طرح اُسے بھی غلّہ دیا جاتا تھا۔ نٹ قوم کے ہر فرد کے جسم کی توڑ موڑ اور کشتی کی مہارت بیان سے باہر ہے۔ ہر آدمی اُن سے واقف ہے کہ بچپن سے ان کا پیشہ اور کام ہی یہی ہے۔ سات برس برابر کسرت کرنے اور کشتی لڑنے میں وقت صرف کرتا تھا۔ گھر میں بھینس کا دودھ پکا ہوا سارا دن میں کئی مرتبہ کر کے پی جاتا تھا۔ بھیگے ہوئے چنے بھی چبا جاتا تھا۔ اور اس قدر دم خم بڑھا ہوا تھا کہ بیسیوں پہلوانوں کو ایک ایک کر کے لڑا دیتا، وہ سب تھک کر بیٹھ جاتے تب اُستاد سے کہا کہ آپ زور کرا دیں۔ پھر وہ مجھ سے اُٹھ کر زور کراتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی قوم کے کسی دوسرے نٹ نے کہا، دل چاہتا ہے کہ میں جا کر انور میاں کو لڑاؤں۔ یہ سنتے ہی اُستاد نے کہا اگر ایسا خیال ہے تو پہلے لنگوٹ باندھ لو۔ میری تمہاری کشتی ہو جائے اگر مجھے جیت لو گے تو کہوں گا کہ وہاں جا کر انھیں لڑاؤ۔ ورنہ وہاں جا کر نٹ قوم کی بدنامی نہ کرنا میری اور اُن کی کشتی بہت کانٹے کی ہوتی ہے۔ اُس نے کہا اگر ایسا ہے تو پھر میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ میں ہر سال کوئی تاریخ مقرر کر کے ایک دنگل کر دیتا تھا۔ میں خود کبھی دنگل میں نہ لڑتا تھا۔ بے شک اُس کا انتظام میرے ہی ہاتھ میں تھا۔ میرے قرب و جوار کے مشہور پہلوان اکثر

میرے بنجی اکھاڑے پر آجاتے تھے اور کہتے تھے بھیّا ارادہ ہے کہ آج یہیں زور کرلیں۔ میں کہتا بڑے شوق سے جس سے جی چاہے زور کرلو۔ وہ تو چونکہ مجھے آزمانے آیا ہے اس لئے کہتا بھیّا آپ ہی زور کرادیں۔ میں اُٹھ کر زور کرادیتا اور ہمیشہ انھیں زیر کرکے واپس کرتا۔ بہرحال اس سال جب میرے دنگل کا اعلان ہوا تو ایک ماہ قبل کوئی مشہور پہلوان لاہور کا آیا ہوا تھا۔ اور ضلع کے مشہور مشہور پہلوانوں نے کُشتی لڑکر انھیں ایک ایک منٹ میں زیر کرکے سینے پر سوار ہوجاتا تھا۔ کافی شہرت تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ دنگل میں ضرور آئے گا۔ اُسی زمانے میں گوکنا گھاٹ کے ایک ٹھاکر صاحب جو بمبئی میں کُشتی لڑتے تھے اور شہرت تھی وہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے پاس خاص طور سے آدمی بھیجا اور کہا آپ ضرور آئیے گا اور اگر وہ لاہوری پہلوان آگیا تو اُس سے آپ کی کُشتی کراؤں گا۔ انھوں نے وعدہ کرلیا مگر عین موقع پر نہ آئے۔ اِدھر لاہور کا پہلوان آگیا۔ صبح سے تمام پہلوانوں کی کُشتیاں طے ہوگئیں اور میں نے لکھ لیا' لاہوری پہلوان بار بار اکھاڑے میں کود کر تال دیتا تھا کہ جس پہلوان کا جی چاہے مجھ سے ہاتھ ملائے۔ سب اُسکی شہرت سے خوفزدہ تھے۔ مگر میرا دِل اُس سے لڑنے کیلئے مچل رہا تھا۔ ہزاروں آدمی دنگل دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ ایک طرف کُرسیاں لگی تھیں

جن پیر والد صاحب۔ تعلقہ دار رسول پور سید محمد مرتضیٰ صاحبا تعلقہ دار عطا گنج علی میاں وغیرہ بیٹھے تھے۔ جب کئی مرتبہ اس نے مبصّروں کو للکارا تو میں نے اس پہلوان سے کہا، بھائی تم مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔ آج میری، تمہاری کشتی ہوگی حالانکہ میرے لئے مناسب نہیں کیونکہ میں ہی دنگل کراتا ہوں اور خود کبھی دنگل میں لڑتا نہیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ آپ واپس جاکر یہ کہیں کہ وہاں تو میری کوئی جوڑ ہی نہ تھی۔ ہاتھ مل گیا۔ والد صاحب اور دوسرے تعلقہ دار صاحبان حیران تھے کہ انھیں آج یہ کیا سوجھی۔ بہر حال میں نے اس پہلوان سے کہا، بیٹھ کر تمام دیہاتی پہلوانوں کی کشتیاں دیکھو۔ سب کے آخر میں میری تمہاری کشتی ہوگی۔ وہ بیٹھ گیا، کشتیاں ہوتی رہیں۔ شام ہونے کو آئی۔ سارا مجمع انتظار میں تھا کہ آج یہ کشتی ضرور دیکھنی ہے۔ غرضکہ وہ وقت آگیا کہ میں لنگوٹ و جانگیہ پہن کر اکھاڑے میں اترا اُس وقت لوگوں کا عجیب عالم تھا۔ اکھاڑے میں ہاتھ ملتے ہی لاہوری پہلوان نے اپنا رواں دواں داؤں "قلاجنگ" لگایا اور میں صاف سر کے اوپر سے دوسری جانب گرا (مگر نقط پہلوان سے زور آزمائی کرنے کے سبب میرے جسم میں بھی وہی توڑ اور پھرتی خوب تھی، چنانچہ میں نے اپنے جسم کو ہوا میں پلٹھا دیا) اور دوسری طرف گرتے ہی برو پنج کھڑا ہوگیا۔ وہ گھبرا گیا کہ آج یہ

کُشتی پھنس گئی ہے۔ اَب میں نے پھر اُسے دَاؤں نہیں کرنے دیا بلکہ دَستی کھینچکر کمر پر آیا، اُس نے بڑی کاٹ کر اپنے کو بچایا، کبھی چپراس پَیروں پر لگائی۔ کبھی حلقوم باندھنے کی کوشش کی۔ اُلغرض پندرہ بیس منٹ تک وہ اپنے کو بچاتا رہا اور لوگوں کو بڑا لطف آیا، آخر میں پھر اُسے موقع ملا اور وہی اپنا منجھا ہُوا دَاؤں قلاجنگ لگایا اور اِس بار نہ بچ سکا تو وہ اُٹھ کر فوراً بغلگیر ہوگیا اور یہ اِعلان کردیا کہ اگر ایک مہینہ میری اَور آپ کی لپیٹ ہوجائے تو اِس جگہ قُرب وجوار میں کوئی دوسرا آپ کو ہاتھ لگانے والا نہیں، یہاں تو اَب تک میں سے جن سے لڑا ہوں وہ بھینسے تھے۔ غرضکہ یہ کُشتی آجتک لوگ یاد کرتے ہیں۔ جس کا ذِکر ابھی حال میں بھائی صاحب بھارت سے آئے تھے کیا تھا اور کہا تھا کہ تمہاری کُشتی اور لاہوری پہلوان کا اِعلان اَب تک لوگ وہاں کرتے ہیں +

(۳) اُسی دَوران نور پور شاہ کا مُقدّمہ لڑا گیا:۔ یہ سلون سے چھ سات میل کے فاصلہ پر کئی لاکھ رُوپے کی بڑی ریاست تھی جو ٹھاکُروں کی تھی۔ اس ریاست کا مالک لاوَلد تھا اَور اس کے سارے کارِندے سسرال کے لوگ تھے۔ اَور جو قریبی وارِث تھا جسے بعد کو ریاست ملنی چاہیئے تھی اُسے علیحدہ کر رکھا تھا وہ غربت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب کے اِنتقال

کے بعد وہ جائز وارث، والد صاحب سے آکر ملا اور سارے معاملات سے آگاہ کیا۔ اور اپنی مجبوری بھی ظاہر کردی۔ والد صاحب نے اُس سے یہ طے کرلیا کہ کچہری میں چل کر لکھ کے رجسٹری کرادو کہ مقدمہ جیتنے پر نصف ریاست مجھے دے دوگے۔ اور نصف تمہارے پاس رہے گی۔ تمام خرچ مقدمہ میں خود کروں گا۔ غرض اُس سے تحریر لکھائی گئی اور صرف تنہا میرے نام سے لکھایا۔ حالانکہ اس میں خرچ کرنے کیلئے حصّے دار تعلقہ دار عطا گنج علی میاں۔ اور سید مرتضیٰ صاحب تعلقہ دار رسول پور۔ اور چچا سید مظفر حسین اور والد صاحب کا صرف دو آنہ حصہ پیروی مقدمہ کے سلسلہ میں تھا۔ جزوی حصہ ایک آنہ دو پیسے کا میرا بھی تھا جس کا خرچ میں دے رہا تھا۔ میں جب بھائی صاحب کے پاس بہرائچ جاتا تھا تو سینکڑوں روپے اُن سے وصول کرکے لاتا تھا اور یہاں انتظام جائیداد دیکھنے کے زمانے میں میرا بیجی کا روبار بھی تھا۔ اِس طرح میں بھی حصّے دار ہوگیا تھا۔ مقدمہ لڑا گیا۔ پہلے رائے بریلی میں چلتا رہا بعدہٗ لکھنؤ ہائی کورٹ میں دائر ہوا لیکن چونکہ ہندو مسلم تعصب بھی چل رہا تھا۔ عدالت کو بھی خیال تھا کہ نصف ریاست مسلمانوں کے پاس چلی جائیگی اور پھر موجود لوگ جو ریاست کے کرتا دھرتا تھے ان کے پاس دولت بھی اتنی تھی کہ ہزاروں روپے کی تھیلی عدالت کو پیش کررہے تھے۔ جب یہ یقین ہوگیا کہ مقدمہ تعصب کی بناء پر

ہار جائیں گے۔ اُس وقت ہائی کورٹ میں پینتالیس ہزار روپے ۴۵۰۰۰
خرچۂ مقدمہ لے کر صلح ہو گئی۔ معاہدہ کے بموجب نصف رقم
اصلی وارث ٹھاکر کو دے دی اور بقیہ نصف رقم جملہ
حصہ داروں کے لئے لے لی۔۔ مجھے بھی بقدر حصہ جو رقم ملی
(اب رقم کی تعداد یاد نہیں) وہ سب میں نے بھائی اختر حسین
کو دے دی یہ کہہ کر کہ پہلے میں آپ سے جاکر بہرائچ سے رقم
لے آتا تھا۔ آپ چونکہ کانگریس نے آپ کو ملازمت سے
ہٹا دیا ہے۔ اب آپ کو ضرورت ہے۔ انھوں نے اُس رقم
سے لکڑی کا کاروبار شروع کر دیا یعنی درخت خریدتے تھے
اور کٹا کر لکڑی مصطفےٰ آباد اسٹیشن سے کانپور۔ الہ آباد وغیرہ
بھیجتے تھے جس سے کافی نفع ہو رہا تھا۔ لیکن اپنی بدانتظامی
کے سبب چند دنوں بعد ہی سب رقم ختم ہو گئی۔

(۴) ذاکری کا شوق :۔ اُسی زمانے میں مجھے ذاکری کا
شوق ہو گیا، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ محلہ ٹیکیا نہ سلون آئمہ میں
شیعوں کی جو آبادی تھی اس میں دو گھر بہت بڑے تھے۔ ایک
میرا گھر تھا دوسرا میر علی حسین کا۔ یہ دونوں گھر، آدمیوں کی
تعداد کے لحاظ سے بھی بڑے تھے۔ اور صاحبِ حیثیت واثر و
رسوخ میں بھی بڑے تھے۔ میر علی حسین صاحب کے گھر میں
مزید خوبی یہ تھی کہ ذاکری کرنے والے چچا سید مظہر حسین صاحب بھی

اور بھائی صادق صاحب، سوزخوانی میں چچا سید ساجد حسین اور
بھائی سید شہنشاہ حسین اپنا جواب نہ رکھتے تھے ۔ ان لوگوں
کے علاوہ ان کے دیگر اشخاص بھی ذاکری اور سوزخوانی نیز
نوحہ خوانی کرتے تھے ۔ اتفاق سے کچھ نوجوانوں کو انکے یہاں
یہ خیال ہو گیا کہ ہم لوگ مجلس کی رونق ہیں ۔ ہمارے پہنچنے
سے مجلس کی رونق اور بھی ہو جاتی ہے اور مجلس بھی ہو جاتی ہے ۔
پس اس خیال نے محلّے میں ایک لہر دوڑا دی ۔ بہت سے نوجوانوں
نے حدیث خوانی، سوزخوانی اور نوحہ خوانی کرنی شروع کر دی
اور بعض اوقات مقابلہ کی صورتیں پیدا ہونے لگیں ۔ اسی زمانے
میں ہمارے بھائی منظر حسین کاظمی عرف مجّن کم سن تھے ۔
مگر بے حد خوش گلو تھے ۔ انھوں نے نوحہ خوانی میں دھوم
مچا دی ۔ چھوٹے تھے اس لئے گود میں لے کر بلند کیا جاتا ۔ دور دور
سے لوگ انھیں سننے آتے ۔ انجمن کے صاحبِ بیاض بنا دیئے
گئے ۔ ان کے بڑے بھائی مشتاق حسین اور اطہر حسین بازو تھے
اور انجمن نے سلون، مصطفےٰ آباد اور رائے بریلی میں بڑی
شہرت حاصل کی ۔ ان کا کمال تو یہ تھا کہ الہ آباد میں بڑے ہو کر
بھی علی غول انجمن بنائی اور پاکستان آ کر راولپنڈی میں
ڈائریکٹر تعلیم ہوتے ہوئے مجلسوں میں نوحہ پڑھتے رہے
انجمن کے ایک رکن مشہور شاعر میرے دوست منجھ جونپوری

بھی موجود ہیں۔ مجّن میاں نے اپنی بھتیجی حُسنہ اور بہن مسعودہ کو بھی سکھلایا، جو عورتوں میں نوحے بہت اچھا پڑھتی تھیں !!

ہمارے یہاں (جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے) سے تین بڑے جلوس آٹھ، نو اور دس محرم کو نکلتے تھے جس میں ذمّوں پر روٹیاں تقسیم ہوتیں اور ہاتھی پر چھوٹے علم ہوتے تھے۔ ان تین جلوس کے علاوہ بگّ ھو چچا کے یہاں سے بھی جو جلوس نکلتا تھا اُس میں مجّن میاں ہی نوحے پڑھتے تھے۔ اس طرح ان کے ذمّہ چار جلوس ہو گئے۔ جبکہ مظہر چچا وغیرہ کے یہاں سے صرف سات محرّم کے جلوس میں اقتدار صاحب پڑھتے وہ بھی بے حد اچھا پڑھتے تھے +

پھر حدیث خوانی کا شوق کیا، جہاں سے جو کتابیں ملیں نوٹ تیار کئے۔ اگر کسی بڑے ذاکر کی مجلس سُنی تو چونکہ اُسوقت دماغ بھی تر و تازہ تھا مجلس سے گھر آکر قریب پوری مجلس قلمبند کر لیتا تھا۔ غرض ابتداء ہو چکی تھی۔ پھر والد صاحب بھی ذاکرِ اہلبیت تھے انھوں نے ایسا کیا کہ ہر مجلس میں کہہ دیتے "بسم اللہ تبرّکاً تھوڑا سا پڑھو"۔ پھر رائے بریلی میں مولانا کاظم عسکری صاحب کا ساتھ ہو گیا، بلکہ ایک ہی گھر میں قیام رہا، انھوں نے ہر شب جمعہ مجلس کا بندوبست کر لیا۔

چند آدمی بیٹھ جاتے' اور مجھ سے کہتے کہ پڑھو۔ یوں سلسلہ قائم رہا۔ سلون اور رائے بریلی کے بعد لکھنؤ کے قیام میں مجالس پڑھنے اور سننے کے زیادہ مواقع حاصل رہے ہے۔ غرض اسطرح شوق میں اضافہ ہوتا رہا۔ راولپنڈی گئے تو یہاں مستقل امام بارگاہ حبار حسین میں پورا عشرہ پڑھتا اور یہ سلسلہ قائم رہا جب تک کراچی نہیں چلا گیا۔ وہاں جاکر بھی مجلسیں پڑھنی پڑیں لیکن اب میں نے یوں کمی کردی کہ آنکھوں سے کم دکھائی دینے لگا۔ کانوں سے بھی کم سنائی پڑنے لگا۔ اور پھر شریکِ حیات نے ساتھ چھوڑ دیا اور چونکہ وہ لاولد تھیں لہٰذا اب تنہائی کی زندگی پریشانیوں میں گزرنے لگی۔ اس طرح ذاکری کا سلسلہ اور ڈاکٹری کا سلسلہ جس کا ذکر تھوڑی دیر بعد ہوگا جس کی عمر اور ازدواجی زندگی کی عمر برابر ہے۔ اور وہ ان کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی اور ان کے ساتھ ہی دفن کردی۔

(۵) ڈاکٹری کا سلسلہ :۔ چچا منظر حسین صاحب عرصہ پچاس سال سے "ہومیو" ڈاکٹری کر رہے تھے۔ مجھے کچھ ایسا شوق تھا کہ میں ان کے دوا خانے میں برابر موجود رہتا تھا ایک آنہ یومیہ دوا کی قیمت تھی۔ مریضوں کی کثرت تھی۔ اکثر دن میں ۲ - ۳ بجے کھانے کا موقع ملتا تھا۔ گھر پر مریض کو دیکھنے جانے کی فیس دو روپے تھی۔ میں ان کی کتابیں بھی پڑھتا رہتا تھا اور

اُن سے مختلف سوالات کرتا رہتا تھا جب زیادہ شوق دیکھا تو
انہوں نے کچھ وقت نکال کر مجھے پڑھانا اور سکھانا شروع کیا اور
نام ادویات اور امراض پر نوٹ لکھنا بھی شروع کر دیا چند ہی
دِنوں میں اس قدر مشّاق ہو گیا کہ وہ مجھ سے سوال کریں تو اکثر یہ
کہہ دیتا کہ ڈاکٹر بیاری لعل نے اپنی کتاب میں اس کے متعلق یہ
لکھا ہے اور بھٹّاچاریہ نے اور پارس ناتھ جیرجی (بنگالی پوربیئے)
نے یہ لکھا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ تو وہ کہتے کہ تم تو حافظ جی ہو گئے
ہو۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ مجھے شاگرد رشید کہنے لگے تھے ۔
اور اب کبھی کبھی دن کے لئے رائے بریلی یا لکھنؤ چلے جاتے اور
یہاں سارے مریضوں کو مَیں ہی دیکھتا تھا ۔ خاص خاص کیسیس
بھی انجام دیئے جن کے ذکر میں طول ہونے کا اندیشہ ہے ۔
بہر حال اِس قدر مہارت مجھے چچا مظہر حسین صاحب سے حاصل
ہو گئی تھی کہ اب مَیں سنگین کیس بھی دیکھتا ۔ اور وہ کہتے کہ
شاباش مَیں بھی اِسی قدر کر سکتا تھا جو تم نے کیا ۔ اسی زمانے
میں (یعنی ۱۹۲۲ء میں) مجھے دُنیاوی زنجیروں میں جکڑ دیا
گیا ۔ جو بالکل میری منشا اور خواہش کے خلاف تھا ۔ اِسکی
تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو :-

(ازدواجی زندگی اور ڈرامائی شادی)

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ میرے اصلی پر دادا ضامن حسین کو
جو موروثی نواب تھے اور علاقہ سیتھی جو ضلع الہ آباد اور
فتحپور ہسوہ کا درمیانی علاقہ ہے۔ وہاں ہیڈ کوارٹر تھا اور ان
اضلاع کے مواضعات کا انتظام کرتے تھے۔ اصل رہائشی مکان
جو محل کہلاتا ہے وہ قصبہ ایرانواں (موجودہ نام "ایرایاں")
سادات میں ہے اور انقلابات زمانہ کے سبب سلون، ضلع
رائے بریلی کا قیام بہ سلسلۂ تبنیت شروع ہوا۔ میرا ننہال بھی
اسی طرف ہے یعنی والد صاحب کی پہلی شادی جو غالباً ۱۸۹۶ء
میں ہوئی وہ ایرایاں سادات میں میر صفدر حسین کی بیٹی (مسدرہ بی بی)
سے ہوئی اُن سے دو بچے ایک لڑکا اور لڑکی ہوئیں۔ جب میری
اُن والدہ کا انتقال ہو گیا تب ۱۹۰۱ء میں والد صاحب کی دوسری
شادی منڈوہ سادات میں آل حسن کے یہاں ہوئی۔ جو ہم سب
بھائی بہنوں کی ماں ہیں۔ میری والدہ تین بہنیں اور ایک بھائی
(تونگر حسین) تھے جو مختلف البطن تھے۔ اور انھوں نے اپنا
قیام کردہ مانک پور میں رکھا۔ نانا صاحب کے انتقال کے بعد
میری نانی صاحبہ زیادہ تر اپنی تینوں لڑکیوں کے یہاں رہا کرتی تھیں
میری سب سے چھوٹی خالہ صرف دو لڑکیاں چھوڑ کر وفات پا گئیں۔
جب اُن کی بڑی لڑکی ہوئی تو میری ماں جو سب سے بڑی بہن
تھیں اپنی چھوٹی بہن سے اس لڑکی کو میرے لئے مانگ لیا جو،

والدہ صاحبہ نے منظور بھی کیا۔ اس طرح بچپن سے ہم دونوں سُنتے رہے کہ
ہم لوگوں کا رِشتہ ہو چکا ہے۔ اِس لئے فطری طور پر اُنس بڑھتا
رہا۔ اور ہم دونوں کی خواہش بھی یہی تھی کہ یہ رِشتہ ہو مگر چھوٹی
خالہ کے اِنتقال کے بعد ان کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔
اور یہ دونوں بچیاں نانی صاحبہ کے پاس عُسرت سے رہنے لگیں،
کیونکہ نانا صاحب بھی حیات نہ تھے۔ اِس طرح میرے والد صاحب
جن کے تعلقات اور اثرات بہت زیادہ تھے ان کی توجہ اُس
طرف نہ رہی۔ حالانکہ والدہ صاحبہ کی دِلی خواہش یہی تھی۔ اِن
حالات کو دیکھتے ہوئے نانی صاحبہ نے دونوں لڑکیوں کی بھی شادی
وہیں ایک ساتھ کر دی۔ اب جبکہ اُدھر سے نا اُمید ہو گیا تو میں
یہ طے کر لیا کہ میں اَب شادی نہ کرونگا۔ چنانچہ اکثر احباب سے
کہدیا کہ میرا اِرادہ شادی کا نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو پہلوانی کا
شوق ہے۔ بڑے بڑے رشتے رہے یعنی تعلقہ دار رسول پور
کی لڑکی سے اور اسی طرح راجہ صاحب سلیم پور کی ایک لڑکی
کے لیے لوگوں نے بڑی کوشش کی، سُنتے ہیں کہ اُس لڑکی کے پیر
میں کسی قدر لنگ تھا۔ بہر حال والد صاحب بھی یہی کہتے رہے کہ
لڑکا شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اُدھر جو میرے بچپن کی منگیتر تھیں
وہ پانچ بچوں کی ماں ہونے کے بعد بیوہ ہو گئیں اور اپنے تمام
بچوں کی شادی کر دی۔ جو بہتر حالت میں ہیں۔ اَب اِدھر کی

کیفیت سنیے کہ ایک دن میری موجودہ شریک حیات کی دادی صاحبہ (سکینہ بی بی) جو میر بنیاد حسین کی بیوہ تھیں اور اُن کے تین لڑکے تھے (امیر حسین۔ وزیر حسین شبیر حسین) سکینہ بی بی، میرے والد کی بھی بزرگ تھیں اور ان کے گھر مذکورہ بالا تینوں لڑکوں کا انتقال "ٹی بی" کے مرض میں ہوا تھا اور اُن کے بیویوں اور بچوں کا بھی انتقال ہو گیا تھا، بجز میری اہلیہ (صغیر بانو) کے جو وزیر حسین کی بیٹی تھیں یعنی اِس گھر میں صرف اہلیہ کی دادی اور ماں صفدری بیگم تھیں یا ان کے دادا کے زمانے کا ملازم مجید خاں تھا، جو ڈیوڑھی چھوڑ کر نہیں گیا بلکہ یہیں اِنتقال کیا۔ جو میری شادی کے ایک سال بعد ہوا۔

اِتفاق کی بات ہے کہ ایک روز اِنکی دادی (سکینہ بی بی) نے مجید خاں کو بھیجا کہ وہ میرے والد صاحب اور چچا مظفر حسین کو بُلا لائیں۔ فوراً میرے والد اور چچا ان کے ہمراہ مکان پر گئے۔ اِن کی دادی سے کہا بھیا بیٹھ جاؤ۔ بہت ضروری کام سے بُلایا ہے۔ والد اور چچا نے کہا آپ حکم دیں ہم لوگ تعمیل کیلئے حاضر ہیں۔ تو سکینہ بی بی نے کہا بھیا تم لوگ جانتے ہو کہ اس گھر کی کس طرح تباہی ہوئی اور اب یہی ایک لڑکی ہے باقی گھر میں کوئی چراغ جلانے والا نہیں، والد صاحب نے کہا، ہم سب آپ کے بچے ہیں۔ اور ہر حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہیں۔ اب انھوں نے

'بھیا آپ لوگوں کو خدا نے چھ چھ بچے دیے ہیں' میں چاہتی
ہوں ایک بچہ مجھے دے دیں ۔ والد صاحب جواب دیا سب
بچے آپ کے ہیں آپ جس بچے کے لئے حکم دیں' میں ابھی اُس کو
آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں وہ آپ کا بیٹا ہوگا اور آپ ہی
کے یہاں رہے گا۔ معظمہ نے کہا' بھیا اس طرح نہیں بلکہ مجید خاں
سے کہو سامنے مکان سے جاکر مولانا ناصر حسین ابنِ
امجد حسین کو بلا لائیں۔ چنانچہ مولانا صاحب' مجید خاں کیساتھ
فوراً آ گئے ۔ سکینہ بی بی نے کہا بیٹا ذرا تسبیح تو اور دیکھو یہ رشتہ
بچی کا انور میاں کے ساتھ مناسب ہے ۔ انھوں نے استخارہ
کیا اور وہ بھی آ گیا ۔ بس اسی وقت تحفۃ العوام میں
دیکھ کر ایک تاریخ اُسی مہینے کے اندر مقرر کر دی گئی ۔ پھر وہاں
سے آکر والد صاحب نے بھائی واحد حسن کو بلا کر کہا کہ تم انور کو
راضی کرو ہم لوگ یہاں ان کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے
مجھ سے کہا اور بہت زور دے کر کہا' انور میاں! تمہارے
چچا نے مثل باپ کے تم لوگوں کی پرورش کی ہے ۔ اُن کی بھی
دلی خواہش ہے کہ تم اس نسبت کو منظور کر لو ۔ میں نے اسکے
جواب میں کہا اگر چچا کی خواہش ہے تو میں کسی طرح انکار نہیں
کرسکتا ۔ اگر وہ مجھے حکم دیں کہ آگ میں کود جاؤ تو میں بلا عذر
فوراً چھلانگ لگا دوں گا ۔ الغرض شادی ہو گئی ۔ عقد پڑھنے

والوں میں میری جانب سے مولانا ناصر حسین قبلہ مجتہد لکھنؤ
اور دوسری طرف سے مولانا ناصر حسین ابنِ امجد حسین سلون
ضلع رائے بریلی تھے۔ والد صاحب نے دُنیا داری کے طور پر
رسم چوتھی وغیرہ اپنے گھر سے کیا اس کے بعد سارا سامان جہیز کا
آدمیوں کے ذریعہ ان کے گھر واپس پہونچا دیا جو ایک کمرے کی
زینت بن گیا اور مجھے بلا کر والد صاحب نے کہا انور میاں آج
سے تمہارا گھر یہ نہیں بلکہ وہ ہے جہاں تمہاری شادی ہو گئی
ہے۔ ہم کو اس کی خواہش نہیں کہ تم کما کر دو بلکہ تمہیں ضرورت
ہو تو مجھ سے لے لینا۔ ہیں ان لوگوں کو تکلیف ہوئی تو مجھے
رنج ہوگا۔ میں نے فوراً سرِ تسلیم خم کر کے سلام کیا اور اسیوقت
سسرال گیا ان کی دادی اور والدہ کو مودبانہ سلام کیا' اب
مستقل رہائش میری یہیں ہو گئی۔ کسی وقت اپنے گھر آ جاتے
تو میری والدہ فرماتیں' میں نے یہ چیز پکائی ہے کھا لو۔ میں
مہمان کی طرح کھا لیتا۔ اُدھر حالت یہ تھی کہ کھانا تیار رہا' اور
مجید خاں میری تلاش میں نکلے۔ وہ جانتے تھے کہ میری بیٹھک
کہاں کہاں ہوتی ہے۔ جیسے ہی میں نے دیکھا' دوڑ کر قریب پہنچا
اور دریافت کیا' کیا کام ہے؟ مجید خاں نے کہا' کھانا تیار ہے چلکر
کھا لو۔ میں اکثر کہتا کہ آپ لوگ کھانا کھا لیا کریں میرا انتظار نہ کیا
کریں۔ میں بعد میں کھا لوں گا۔ مگر مجید بابا کہتے' یہ کیسے ہو سکتا ہے'

اَب آپ گھر کے مالک ہو۔ جب تک آپ نہ کھالیں گے کوئی نہ کھانا کھائے گا۔ اس لئے میں اپنا کام چھوڑ کر وقت سے جاکر کھانا کھالیتا تھا، کیونکہ جب تک میں نہ کھالوں؛ نہ مجید بابا کھاتے تھے اور نہ میری اہلیہ و دادی۔ اور اصغر بھائی کی یہ حالت تھی کہ مسلسل چھ مہینہ تک برابر یہیں آکر کھانا کھاتے تھے اور کہتے کہ بھائی ہم تو وہاں سے کھائیں گے وہاں روزانہ مُرغ ملتا ہے۔ اب شادی ہوجانے کے بعد پہلے تو مَیں نے تحصیل سکون ہی میں بطور کینال کلرک چند ماہ کام کیا، اسی دَوران مجید بابا کا اِنتقال ہوگیا۔ ان کی تجہیز و تکفین اِس طرح کی کہ ہزاروں آدمیوں کا مجمع جنازے کے ہمراہ تھا۔ شیعوں اور سُنّیوں نے علحٰدہ علحٰدہ نمازِ جنازہ پڑھی اور مثل اپنے خاندان کے بزرگوں کی طرح فاتحہ درُود وغیرہ کیا گیا۔ پھر لکھنؤ جاکر ۲۳ دسمبر ۱۹۰۲ء کو "آر۔ آئی۔ اے۔ ایس۔ سی" میں بطور کلرک بھرتی ہوگئے۔ اِسی دَوران مُعین ہومیو پیتھک کالج ہردوئی جو ۱۹۰۶ء سے برٹش گورنمنٹ کا منظور شدہ کالج تھا اور جس کی ایک برانچ لکھنؤ میں تھی۔ وہاں سے اِمتحان دے کر "ایم۔ ڈی۔ ایچ" فرسٹ ڈویژن کی ڈگری حاصل کی اور اب باقاعدہ پارٹ ٹائم لکھنؤ میں ہومیو پریکٹس شروع کردی۔ لکھنؤ کی ملازمت کے زمانے میں ہی اُہلیہ کی دادی (سکینہ بی بی) کا اِنتقال ہوا اور مَیں دفن میں شریک نہ ہوسکا، البتہ سوئم میں آکر شریک ہوا۔ اب گھر میں صرف

یہ ماں بنتی رہ گئیں۔ اور جس آرزو سے یہ شادی ہوئی تھی اُسکی حسرت ان کے مجیب بابا اور دادی (سکینہ بی بی) اپنے دِلوں میں لئے ہوئے دنیا سے گزر گئے۔ اب کچھ آثار حمل کے ظاہر ہوئے اور تکلیفیں ہوئیں تو لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ ان کے پیٹ میں پھوڑی ہو گئی ہے۔ لہٰذا لیڈیز ہسپتال پرتاب گڈھ میں داخل کر دی گئیں۔ وہاں آپریشن ہوا۔ اور ایک ماہ بعد وہاں سے ریلیف کی گئیں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ پھوڑی تھی یا حمل جو ہم لوگوں کو دکھلایا نہیں گیا اور اس آپریشن میں کیا خرابی پیدا کی گئی کہ آئندہ کے لئے یہ حسرتِ خواب و خیال بن کر رہ گئی حالانکہ لکھنؤ میں ڈاکٹر، حکیموں کا علاج ہوا۔ راولپنڈی آنے کے بعد ڈاکٹر اور حکیموں کا علاج رہا۔ خود جو بھی بہتر سے بہتر ہومیوپیتھک دوا ہو سکتی تھی استعمال کرائی لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور آئندہ زندگی کا کوئی انتظام نہ کیا بلکہ ہر شئے پر مایوسانہ نظر پڑتی تھی کہ یہ کیا ہوگا اور کس کے لئے کیا جائے، یا یہ کہ اب میرے بعد کون ایسا ہمدرد ہے کہ جو یاد رکھے گا اور سورۂ فاتحہ پڑھے گا۔ بظاہر دنیا داری کے طور پر شاید سال بھر تک فاتحہ درود ہو جائے۔ بعد میں کوئی نام بھی نہ لے گا۔ گفتگو کو آخر تک پہونچا کر پھر دوسرا سلسلہ شروع کرونگا۔

میری اہلیہ بڑی خوش قسمت تھیں اور ان کو مسلسل مذہبی

رُجحان رہتا تھا یعنی ہر سال عشرۂ محرّم میں زنانی مجالس کرنا بلکہ سلسلہ سیوم، دسواں، بیسواں، چالیسواں تک۔ اور پھر ۸ ربیع الاوّل تک قائم رہتا۔ نوچندی جمعرات کی مجلس کیا کرتیں۔ رات میں کوئی خواب دیکھا تو اٹھ کر کہتیں کہ تھوڑی سی مٹھائی لیتے آؤ نذر کر دیں۔ بہت اچھا خواب دیکھا ہے۔ پھر کسی کے بچے کی شادی ہونے لگی، تحفہ دینا لُطف لے کر جاتیں، اگر کسی یتیم بچی کی خانہ آبادی کا موقع ہوتا تو حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ مدد کرتی تھیں اور میں اُن کے اِن کاموں میں کبھی مداخلت نہ کرتا تھا۔ جو تنخواہ ملے اور جو ٹیوٹی اکیڈمی میں ملا، سب انہیں دے دیتا کہ آپ جیسا چاہیں گھر چلائیں۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں ۱۱ اگست کو ریٹائر ہوا اور سنہ ۱۹۷۰ء میں، ۷ اگست کو زیارات عتبات عالیات، ایران، عراق اور شام کی معہ اہلیہ کے چلے گئے۔ اور مکمل زیارتیں، تین مہینے رہ کر اچھی طرح کیں۔ خشکی راہ سے آنا جانا ہوا۔ اِس طرح درمیان کی زیارت گاہیں نہیں چھوٹ سکیں۔ زیارات سے واپسی پر کچھ دنوں بعد کراچی چلی گئیں اور وہیں "ہارٹ فیل" ہو کر ۲ اکتوبر سنہ ۱۹۸۱ء بروز جمعہ اِنتقال فرمایا، اور ان کی وصیت کے بموجب ان کی آخری آرام گاہ "جنت البقیع" کراچی میں بنائی گئی۔ ان کے اِنتقال کے بعد میں نے ھومیوپیتھک ڈاکٹری جس کا سلسلہ لکھنؤ کے ......

بعد راولپنڈی میں رہا اور پھر کراچی جا کر گورنگی ۳ء میں قائم رہا، وہ بھی بند کر دیا۔ اور تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

"واقعاتِ ہجرت"

۲۳ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو لکھنؤ میں R-I-A-S.C. میں بطور بی "گریڈ کلرک بھرتی ہوا۔ ڈپارٹمنٹل امتحان پاس کرنے کے بعد یکم جون ۱۹۴۵ء کو گریڈ "اے" ہو گیا اور بطور انچارج گروپ کام کرنے لگا۔ جولائی ۱۹۴۷ء کو فائنل پاکستان آپشن دیا۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء سے پاکستانی کہلانے لگا۔ اسپیشل ٹرین ۱۶ر اور ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ملیں۔ اس دوران بھارت حکومت نے تعصب میں کسی کی سروس بک میں ڈزرشن کسی کے لئے روش لکھ دیا۔ چنانچہ یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء کو میرے سروس بک میں بھی روش کا اندراج کر دیا گیا۔ اور ۱۶ر و ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء کی چلی ہوئی ٹرینیں ایک ساتھ پانچ یوم بعد ۲۱ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو چکلالہ پہونچیں۔ دورانِ سفر سب سے پہلا مورچہ سہارن پور میں ہوا۔ صبح کے وقت ٹرین اسٹیشن پر پہونچی اور ایک فوجی دستہ اسٹیشن آ کر اس نے پل کے اوپر مورچے لے لئے۔ اور کہا کہ ہم ٹرین کی تلاشی لیں گے۔ کرنل حمید جو پاکستان سے لکھنؤ ملٹری اسپیشل لانے کے لئے گئے تھے۔

اور ٹرین کے اِنچارج تھے۔ انھوں نے کہہ دیا کہ یہ ملٹری اسپیشل ہے۔ ہم تلاشی نہیں دیں گے۔ اُدھر سے اِصرار ہوا کہ ہم بِلا تلاشی ٹرین کو چلنے نہیں دیں گے۔ ہمارے ٹرین پر بڑوا رے کے تین سَو فوجی جوان تھے۔ انھوں نے زمین پر لیٹ کر مورچے لیلیے۔ اور کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم کو یہاں پاکستان سے کمک نہیں پہونچ سکتی لیکن ہم تمہارے شہر سہارنپور کو مٹی کا ڈھیر بنا دیں گے تب تم ٹرین تک پہونچ سکو گے۔ غرض کہ شام کو پانچ بجے تک یہی جھگڑے ہوتے رہے اور جب کسی طرح تلاشی نہ لے سکے تب پانچ بجے کے بعد ٹرین کو آگے چلنے کی اِجازت دی۔ راستے میں اکثر مسلمان مِل جاتے تو انھیں بھی ٹرین میں بیٹھا لیتے، خواہ ہم لوگوں کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ جب یہ ٹرین امرتسر اِسٹیشن پہونچی، رات کا وقت تھا۔ سِکھوں نے ٹرین پر حملہ کر دیا۔ گاڑی کھڑی تھی تمام سپاہی گاڑی سے نیچے کود پڑے اور رائفلوں کو کوڈ کرنا شروع کر دیا۔ اور سِکھوں کو للکارا۔ یہ کیفیت دیکھ کر تمام سِکھ بھاگ گئے اِسٹیشن کا اِسٹاف بھی رفوچکر ہو گیا۔ مسافر اپنا سامان پلیٹ فارم پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہم لوگ چاہتے تو سامان اٹھا کر ٹرین میں رکھ لیتے۔ مگر ایسا نہیں کیا۔ دو گھنٹے بعد اسٹیشن کا اِسٹاف آیا اُس وقت ہماری ٹرین آگے چلی۔ جب یہ گاڑی آخری اِسٹیشن اٹاری پہونچی تو وہاں گورکھا رجمنٹ نے گھیر کر فیر کھول دیئے، اور ہمارے

سپاہیوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ اٹاری سے تین
میل کے فاصلہ پر پاکستان کا واگھا اسٹیشن ہے۔ یہاں بلوچ
رجمنٹ پڑی ہوئی تھی۔ جب فائرنگ کی آواز سنی تو گاڑیوں پر بیٹھ کر
فوراً اٹاری اسٹیشن آ کر گھیر لیا اور مشین گنیں کھل گئیں۔ پندرہ،
بیس منٹ تک فائرنگ ہوتی رہی۔ اس کے بعد سفید جھنڈیاں
بلند کر کے فائرنگ رک گئی۔ صرف ایک آدمی ہماری طرف کا اس
فائرنگ میں ہلاک ہو گیا۔ دوسری جانب معلوم نہیں ہو سکا کہ
کس قدر ہلاک یا زخمی ہوئے۔ اب یہاں سے ٹرین ڈرائیور، اور
ٹرین گارڈ نے آگے چلنے سے انکار کر دیا کہ اب آگے سرحد ہے ہم
نہیں جائیں گے، اپنی ٹرین لے جاؤ۔ کرنل حمید نے کہا کہ تم لے چلو
لاہور تک ہم تمکو بخیریت تمام واپس کر دیں گے۔ وہ کسی طرح
راضی نہ ہوئے۔ تب ٹیلیفون لاہور کیا گیا جہاں سے ایک انجن
مع ٹرین گارڈ روانہ ہوا اور دو گھنٹے کے درمیان اٹاری
پہنچ گیا جو ٹرین کے ساتھ لگا کر ٹرین کو لایا۔ اس دو گھنٹہ میں
اٹاری اسٹیشن کے باہر ہم لوگوں نے دیکھا جا بجا بچے۔ بوڑھے
جوان۔ اور عورتیں ذبح کی ہوئی پڑی ہیں۔ کھیتوں میں اگر چھوٹا
کنواں بنا ہے تو اسے لاشوں سے پاٹ دیا گیا ہے۔ اس دوران
سامنے کھیتوں میں دیکھا کہ ایک مسلمان کو دو تین سکھ پکڑ کر لیجا
رہے ہیں۔ سپاہیوں نے دوڑ کر للکارا تو سکھوں نے اس آدمی کو

حوالے کر دیا اور کہا یہ ہم کو مل گیا تھا بطور امانت تمہارے سپرد کرنے کے لئے لا رہے تھے۔ وہ آدمی بھی لاہور تک ساتھ آیا، وہاں سے اسے کیمپ بھیج دیا گیا۔ الحاصل جب ٹرین اٹاری سے واگھا اپنے حد میں آ گئی تو یہاں پاکستان فلیگ کو فوجیوں نے سلامی دی اور یہاں جو بلوچ رجمنٹ تھی اس نے ہم لوگوں کو کھانا اور پانی دیا کیونکہ کئی کئی روز کے بھوکے پیاسے تھے۔ راہ میں کسی نل سے پانی لینے کی اجازت نہ تھی کیونکہ اس میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ جب اپنی ٹرین رکتی تو انجن کے پاس لوٹا لیکر جاتے تھے اور کھولتا ہوا (گرم) پانی بھر کر لاتے تھے۔ اسمیں چائے، چینی ڈالکر چائے پیتے تھے اور جو خشک سامان ساتھ کھانے کو وہ لیتے تھے۔ اگر جنگل میں ٹرین سگنل نہ ملنے سے کھڑی ہو گئی تو بیر کے درختوں سے بیر توڑ کر کھاتے تھے۔ اگر کوئی کھیت آدکھ کا نظر آجاتا تو اوکھ اکھاڑ لاتے تھے۔ جب ہم لوگ پھر سوار ہو جاتے تب ٹرین چلتی۔ بہرکیف ابھی ٹرین واگھا میں کھڑی تھی کہ مہاجرین کی ٹرین ادھر سے بھارت جا رہی تھی۔ جب وہ واگھا میں رکی تو دس بارہ آدمیوں کو کھڑا کر کے گولی ماردی اور لاشیں اس ٹرین میں ڈالدیں کہ انھیں ادھر لیتے جاؤ۔ اس کے بعد ٹرین لاہور کو اور آگے راولپنڈی۔ چکلالہ تک لائی گئی۔ راستے میں غریب تباہ حال مہاجر ٹرین کے پاس آجاتے۔ جو شخص سے جو بھی ممکن تھا وہ ان کو دے دیتا۔ چکلالہ میں کیمپ لگے

ہوئے تھے۔ ٹرین سے اتر کر اپنا سامان لئے ہوئے کسی جھولداری میں قیام کر لیتے۔ سردیوں کا زمانہ، ٹرین پر لیٹ کر گزارہ کرتے تھے۔ ہفتہ عشرہ کیمپ میں رہے۔ پھر راولپنڈی شہر میں گھوم گھوم کر خالی مکانوں پر تالے توڑ توڑ کر لوگ قبضہ کرتے رہے۔ کچھ لوگ مِل جُل کر ایک مکان میں قیام کرتے تھے۔ غرضکہ شریف لوگ تباہ رہے اور جن کو شرافت سے سروکار نہ تھا وہ شہر میں جابجا مال و دولت لوٹتے پھرتے تھے۔ بدمعاشوں کی چاندی تھی اور شرفاء اپنی عزت بچا رہے تھے۔ دفتروں میں میز کرسیاں نہ تھیں۔ چھ ماہ چکلالہ میں گھاس پر بیٹھ کر سرکاری کام کرتے رہے۔ کاغذ قلم۔ دوات بھی دفتروں میں نایاب تھا۔ شہر کے گھروں سے ہندوؤں اور سکھوں کے روزنامچے اور بہی کھاتے لے جاتے۔ ایک طرف جو لکھا ہوتا اُسے کاٹ دیتے۔ دوسری طرف لکھ کر ایک دوسرے کو جواب دیتے اور جو ضروری چیزیں ہوتیں ان کو تھوڑا بہت جو کاغذ گورنمنٹ مہیا کرتی تھی اس پر لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ خزانہ خالی تھا۔ شہنشاہِ ایران۔ راجہ محمود آباد اور حبیب بنک کے مالک۔ نواب حیدر آباد دکن امداد کرتے تھے۔ اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے یورپ میں ہوائی جہازوں کی کمپنی میں حصے تھے ان کو فروخت کر کے ملک پاکستان میں خرچ کر دیا۔ پہلی مرتبہ ایک ماہ کی تنخواہ، دوسرے مہینے کی ۲۲ تاریخ کو ملی تھی۔ اُس وقت

جبکہ مُلک میں نہ دولت تھی اور نہ اسلحہ، بھارت نے جیسے سب کچھ انگریزوں سے ملا تھا۔ اُس نے کشمیر میں جنگ شروع کر دی۔ اور سرحدوں پر خون کے دریا بہا دیئے۔ جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر پٹھان نعرہ لگاتے ہوئے اور اپنے ساتھ اپنی بندوقیں لئے ہوئے ہر طرف محاذ پر جاتے تھے۔ اور اس طرح ناچتے گاتے خوش ہوتے ہوئے ٹرکوں پر گزرتے تھے عوام پھلوں کے ٹوکرے ٹرک پر پھینک دیتی تھی کہ یہ کھاتے جاؤ۔ الغرض اُس زمانے کا نقشہ کھینچنا آسان نہیں۔ رات و دِن کی نیند حرام تھی کیسی طرف کسی یتیم بچے کی آہ و زاری کیسی سمت کسی بیوہ کی فریاد۔ المختصر کہ ہر جانب قیامتِ صغریٰ نظر آ رہی تھی۔

یہ ہجرت کے زمانے کا مختصر حال تھا۔ اب دفتری کام کے متعلق جو اپنی استعداد سے بلند کام ہوئے ہیں۔ اُنکا مختصر خاکہ پیش کر رہا ہوں۔

دفتری کارنامے:- (۱) ذکر آ چکا ہے کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۲ء کو بھرتی ہوئے اور یکم جون ۱۹۴۵ء سے گریڈ "A" ہو کر انچارج لگ گئے۔ سب سے پہلے لکھنؤ میں ملازمت تھی۔ ایک موقع پر میں نے ۱۵ یوم کی چھٹی لی۔ درخواست کیساتھ رجسٹرڈ ڈاکٹر کا "M.C" لگا دیا۔ میرے افسر نے یہ لکھ کر کہ "M.C" غلط دیا ہے۔ دراصل یہ بیمار نہیں ہے چھٹی منظور نہ کی۔ جب میں واپس آیا تو معلوم ہوا۔

میں نے جاکر ڈاکٹر کو دوبارہ فیس دی اور اس نے لکھ کر دفتر میں بھیجا کہ معلوم ہوا ہے آپ نے میرے جاری کردہ "M.C" پر چھٹی نہیں دی۔ آپ اس غلطی کا تدارک کریں۔ ورنہ مجھے مجبوراً آپ کیخلاف رجسٹرڈ ڈاکٹر کے "M - C" کی توہین کا مقدمہ قائم کرنا پڑے گا۔ اس تحریر کے آنے کے بعد فل کرنل نے بلا کر میرا بیان بھی لیا اور سیکشن آفیسر کا بیان بھی علحٰدہ علحٰدہ لیا اور اس کے بعد میری چھٹی منظور کر دی ــــــ!!

(۲) جب میرا "A S C" کا دفتر چکلالہ میں تھا اس وقت لیاقت باغ سے چکلالہ کی جانب جانے میں آبادی نہ تھی بلکہ میدان تھا اور بڑے بڑے گہرے نالے تھے۔ یہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ ۱۱ بجے رات کو چکلالہ سے ٹرین جاتی تھی اور اس زمانے میں بہت سے فوجی ریلیز ہو رہے تھے۔ ان کو ریلیز بنیفٹ ملتا تھا۔ کچھ بدمعاش نالے میں چھپے رہتے تھے۔ جب کوئی ادھر سے گزرتا تو اسے قتل کر کے جو کچھ ہوتا لوٹ لیتے تھے۔ کئی قتل ہو چکے تھے۔ اس لئے دفتر میں رات کو ایک کلرک اور ایک افسر کی ڈیوٹی لگائی جاتی تھی۔ افسر صاحبان تو راجہ تھے اپنے بنگلے میں جاکر سو رہتے اور کلرک ہی رات میں فل کرنل ہوتا۔ وہ افسر کہدیتا کہ اگر ضرورت ہو تو اسکوٹر سوار بھیج کر بلوا لینا۔ ایک شب کو میری ڈیوٹی تھی۔ آفیسر ڈیوٹی تو حسب معمول اپنے بنگلے چلے گئے اور یہاں گیارہ بجے رات کے قریب جاسوس نے آکر اطلاع

دی کہ نالے میں کچھ لوگ مشکوک حالت میں دیکھے گئے ہیں، اب مجھے اِتنا موقع کہاں کہ پہلے افسر صاحب کو بُلواؤں تب کارروائی کی جائے۔ مَیں نے فوراً ٹیلیفون اُٹھاکر جو فوجی یونٹ جکلالہ میں موجود تھی، اُس سے کہاکہ فوراً پورے میدان کو گھیر لو اور جو شخص جس حالت میں ملے گرفتار کرلو۔ فوراً فوجی جوانوں نے میدان گھیر کر تین آدمیوں کو گرفتار کرلیا۔ جن کے پاس بڑے بڑے چھُرے تھے۔ ان کو لاکر فوجیوں نے خوب پٹائی کی۔ اب مَیں نے اِسکوٹر سوار کو بھیجا اور افسر صاحب نے آکر میری بڑی تعریف کی۔ اور پھر کہنے لگے ان بدمعاشوں کو گارڈ میں بند کردو صبح کو دیکھا جائے گا۔ مَیں نے افسر صاحب کی رائے کی مخالفت کی اور کہا یہ مناسب نہیں ہے کیونکہ اِن پر مقدمہ چلے گا اور اگر مقدمہ ثابت نہ ہوا تو یہ آپ پر حبسِ بیجا کا مقدمہ چلائیں گے۔ افسر صاحب کہنے لگے پھر تمہاری کیا رائے ہے۔ مَیں نے جواب دیا۔ قریب کے تھانے کو فون کرکے وہاں سے کچھ سپاہیوں کو بلوا لیجئے، وہ آکر انھیں لے جائیں اور حوالات میں رکھیں۔ چنانچہ میری رائے کو پسند کیا اور اس پر عمل کیا۔ مقدمہ میں ان بدمعاشوں پہ کئی قتل ثابت ہوگئے۔ وہ تینوں آدمی فوج ہی کے ریٹائرڈ تھے۔ دِن میں موٹر ڈرائیوری کرتے تھے اور رات میں یہ پیشہ اِختیار کیا ہوا تھا۔ وہ سب سزا پاگئے۔ اس کارنامہ پر اگر انگریزوں کی حکومت ہوتی تو نقد انعام

کے علاوہ ترقی بھی مل جاتی۔ لیکن یہ مسلمان حکومت تھی۔ "CAO" نے دوسرے تمام آفس کے اہل کاروں کو جمع کر کے ایک تعریفی تقریر کر دی کہ یہ ہے حکومت کی خیر خواہی اور اس طرح کام کرنا چاہیئے۔ غرض زبانی تعریف کے علاوہ مجھے کچھ نہ ملا۔

(۳) جب میں "ASC" سے ٹرانسفر ہو کر "GHQ" آگیا تھا تو مجھے "MT2" میں لگایا گیا اور اس زمانے میں جو انگریز افسر ریلیز ہو کر انگلینڈ جاتے تھے اُن کے کاغذات میں تیار کرتا تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۹ء کا ہے۔ یہاں سے کیپٹن اُویرا ئن ریلیز ہو کر انگلینڈ جانے لگا تو پہلے اُس نے درخواست کی کہ مجھے ریلیز نہ کیا جائے میں پاکستان کی نیشنلٹی لینا چاہتا ہوں۔ مگر یہ چیز منظور نہ ہوئی اُسکے کاغذات ریلیز تیار کر کے تین دن قبل میجر حامد حسین کے پاس دستخط کے لئے پٹ اپ کر دیئے۔ دو آفس کاپی پر اپنی دستخط اور تاریخ ڈال دیئے۔ یہ میجر حامد حسین کاغذات کو دستخط کر کے عموماً کئی کئی دن کے بعد بھیجتے تھے۔ اس موقع پر بھی ایسا ہی ہوا کہ آج کیپٹن اُویرائن راولپنڈی سے کراچی روانہ ہو گیا۔ تب دوسرے دن کاغذات لوٹ کر آئے۔ میں نے اُس کاپی پر جو سیکورٹی آفس جانے والی تھی اُسپر لکھ دیا تھا کہ اُس کا شناختی کارڈ نمبر فلاں بھی ساتھ منسلک ہے۔ لہٰذا جب مجھے وہ کاغذات ملے تو میں فوراً میجر صاحب کے پاس گیا اور کہا "آپ نے اُن کا شناختی کارڈ نہیں لیا۔ وہ کہنے لگے تم نے کیوں نہیں لیا۔

میں نے جواب دیا، اگر کاغذات میرے پاس دستخط ہو کر آجاتے تو میں آپکو پہلے ہی اطلاع کر دیتا یا خود لے لیتا، کہنے لگے کچھ نہیں جاؤ جا کر سکیورٹی آفس میں یہ بتلا دینا۔ اور دستی کاپی دے کر آجاؤ۔ میں وہ کاپی خود لے کر........ سکیورٹی آفس گیا۔ اور واقعہ بتلایا۔ مگر انھوں نے وہ کاپی لینے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ جا کر آفیسر سے کہیں کہ وہ امبارکیشن ہیڈ کوارٹر کراچی ٹیلیفون کر دیں کہ شناختی کارڈ انسے لینے کو رہ گیا، وہ لے کر ذریعہ ڈاک یہاں بھیجدیں، جب وہ آجائے تو آکر یہ لیٹر یہاں دے جایئے گا۔ میں نے آکر آفیسر سے کہا لیکن انھوں نے غصّے میں اُس لیٹر کے اُوپر لال پنسل پھیر کر پھینکدیا۔ میں نے وہ کاغذ اُٹھا لیا اور چلا آیا۔ اسی ہفتہ کے اندر امبارکیشن ہیڈکوارٹر سے لیٹر آیا کہ یہاں تلاش سے اُن کا شناختی کارڈ ملا، جو روانہ کیا جاتا ہے۔ اِس قسم کی لاپرواہی کام میں کیوں ہو رہی ہے۔ اب اُس لیٹر پر میجر حامد حسین نے لکھا کہ کلرک متعلقہ جواب دے۔ میں نے مکمّل جواب لکھا، اور آفس کاپی بھی لگائی جس پر میرے دستخط تین دن قبل کی تھی۔ جبکہ آفیسر صاحب کی دستخط اُن کے جانیکے بعد دوسرے دِن کی تھی۔ اور کُل کیفیت بیان کر کے وہ لیٹر بھی لگا دیا جو لال پنسل سے کاٹ کر پھینک دیا تھا، اور لکھا کہ اُسکی کُل ذِمّہ داری اُفسر متعلقہ پر آتی ہے نہ کہ کلرک متعلقہ پر۔ معلوم نہیں کہ

میجر حامد حسین سے کرنل نے کیا کہا لیکن میں نے دیکھا کہ ایک مہینے کے اندر حکم آیا کہ میجر حامد حسین کو جزیرہ مکران پوسٹ کیا گیا تین سال کے بعد پھر وہ واپس "G.H.Q" آئے۔ اور مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا +

(۴) جب میں "H-T-6" میں ۱۹۶۰ء میں تھا۔ پرنٹنگ گروپ کا انچارج تھا اور ملٹری کے ٹریننگ پمفلٹ کی دیکھ بھال اور منظوری وغیرہ دیتا تھا۔ اُس وقت گورنمنٹ پریس جو "G.H.Q" کے اندر قائم ہوا تھا۔ اُس کے معائنہ کے لئے میجر جو اُس وقت سیکشن انچارج تھے، گئے اور مجھے ساتھ لے گئے۔ حالانکہ میں صرف "U-D-C" تھا اور گروپ انچارجی کا کام دیکھ رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کو نہیں لے گئے۔ وہ تو ایک گھنٹہ میں واپس چلے آئے اور مجھے معائنہ کیلئے کہا۔ میں نے تین دن آفیسر صاحب کی جانب سے معائنہ کیا اور مکمل رپورٹ لکھ کر سامنے رکھدی +

(۵) ۱۹۶۹ء کا واقعہ ہے کہ میں "M-Q-3" میں لگایا گیا، اور ملٹری کے لئے جو زمین حاصل کی جاتی ہے۔ اکثر اسکے مقدمات ٹھیکیداروں سے چلتے رہتے ہیں۔ ان مقدمات کی دیکھ بھال میرے ذمے کر دی گئی۔ اتفاق سے ایک مقدمہ وہ آیا جو پانچ چھ سال سے چل رہا تھا۔ اُس میں کچھ زمین زمیندار کی

تھی - کچھ زمین ریلوے کی تھی اور ان دو پارٹیوں کے علاوہ انجنئرنگ برانچ اور ٹھیکیدار سب کے مطالبات جُدا گانہ تھے ۔ کوئی کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا - جنرل ٹِکا خاں اُس وقت کوارٹر ماسٹر جنرل لگے ہوئے تھے ۔ مجھے بلا کر کہا اس مقدمہ کو دیکھو اور اسکا جسٹ بنا کر لاؤ - میں نے آکر سارا دن مقدّمہ کی فائل پڑھی جگہ جگہ نشان لگائے ۔ دوسرے دن جسٹ بنا کر ان کے سامنے لے گیا۔ کہنے لگے یہ مقدّمہ کیونکر طے ہو - کوئی پارٹی راضی نہیں ہوتی - مَیں نے برجستہ کہا - اگر میری رائے لیجئے تو اِنشاءاللہ مَیں دو گھنٹے میں یہ کیس طے کر دوں گا - وہ مُنہ دیکھنے لگے پھر بولے' دو گھنٹے میں یہ کیس طے کر دو گے - مَیں نے کہا آپ مجھے اِجازت دیں کہ میں ہر پارٹی کو سرکلر جاری کر دوں کہ آپ خود یا آپ کا کوئی نمائندہ جو اچھی طرح کیس سے واقف ہو وہ فلاں تاریخ کو ۱۰ بجے دن 'کوارٹر ماسٹر جنرل آفس میں آجائے ۔ اِنشاءاللہ میں سب کی موجودگی میں اُسی وقت اِس کیس کو طے کر دوں گا - انھوں نے اجازت دے دی اور کہا یہ بھی کر کے دیکھو - چنانچہ مَیں نے سرکلر جاری کر دیا - سب لوگ وقت مقرّرہ پر آ گئے ۔ پہلے چائے وغیرہ سے ضیافت کی پھر کیس کے متعلق بات چیت کی اور اُن کے مطالبات کی تائید کی کہ بیشک آپ کا مطالبہ درست ہے لیکن معاملہ اسی وقت طے ہو سکتا ہے جبکہ ہر شخص کسی قدر نرمی سے کام لے - بہرحال

کچھ ان کو دبایا، کچھ انھیں دبایا۔ اور ایک پوائنٹ پر مصالحت ہوگئی۔ فوراً اسٹینو کو بلاکر سب کے سامنے ڈکٹیشن دیا وہ جاکر ٹائپ کرکے لے آیا جملہ پارٹی ممبران سے اسی وقت دستخط لیے لئے اور وہ کیس ختم ہوگیا۔ جس کی کافی شہرت ہوئی۔ اور ٹکا خاں بھی بہت خوش ہوئے +

اعلیٰ تعلیم کا شوق :- پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ رات دن ھاکی کھیل تھا مگر مجھے تعلیم سے دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ تعلیم کے لئے ذہن بہت اچھا تھا۔ اسی بنا پر "ایف اے" فائنل میں (شیعہ کالج لکھنؤ میں) فیل ہوگیا۔ پھر ملازمت کا سلسلہ جاری رہا۔ گویا صرف "میٹرک" تھا۔ اس لئے کلرکی فوجی دفتر میں مل گئی، انگریزی لکھنے پڑھنے میں بہت بہتر تھا جیسا کہ زمانہ سروس کے حالات اور کام سے بخوبی ظاہر ہو چکا ہے۔ میرے ساتھ دفتر میں "بی اے" پاس بھی تھے مگر لکھنے پڑھنے میں صفر کے برابر تھے۔ اکثر لوگ پوچھا کرتے تھے، آپ کی کوالیفکیشن کیا ہے؟ میں کہتا "میٹرک" وہ کبھی یقین نہ کرتے اور کہتے، آپ چھپاتے ہیں۔ اس قسم کے حالات نے دل میں شوق پیدا کیا کہ میں صرف "میٹرک" اور ان لوگوں سے جو "بی اے" ہیں بہتر ہوں تو ڈگری کیوں نہ حاصل کی جاوے۔ حالانکہ اب میرے لئے تمام مضامین میں تیاری کرنا محال تھا، اس لئے خیال کیا کہ صرف

نگریزی زبان میں اِمتحان دے کر ڈگری حاصِل کر دوں۔ اِسمیں یہ مشکل تھی کہ میٹرک تک سائنس لیکر پڑھا تھا اور صرف انگریزی اِمتحان دینے کے لیئے فارسی آنرس کی ڈگری پہلے لینی چاہیئے۔ بہرحال دِل میں قوّت اور ارادہ میں اِستحکام پیدا کرکے فارسی کا کورس منگوالیا۔ جس میں عربی زبان میں شعر و نثر بھی تھا۔ غرضیکہ مجھے محنت کرنی پڑی۔ حالانکہ کوئی کلاس میں داخلہ نہیں لیا اور اِمتحان دے کر آنرس کی ڈگری لے لی۔ پھر تو میرے لیئے آسان تھا۔ "ایف اے" کا کورس دیکھکر امتحان پاس کرلیا۔ پھر "بی اے" کا کورس دیکھ کر اُسے بھی پاس کرلیا۔ اِس طرح ڈگریاں اُس وقت حاصل کیں۔ جب میری عمر پچاس سال سے اوپر ہو چکی تو سُنا کرتا تھا کہ شیخ سعدی نے بہ سال کی عمر میں فارسی پڑھی اور شہرت حاصل کی لیکن عمر کے لحاظ سے اُن کا ریکارڈ توڑ دیا۔

"آفاتِ زمانہ اور اِسکا صبر سے مقابلہ"

(۱) زمینداری کے سِلسلہ میں ذِکر آچکا ہے کہ مَیں نے والد صاحب کی حیات میں سات برس زمینداری کا کام دیکھا۔ اور اِس طرح اس کام میں ترقی دی کہ خود کاشت کھیتوں میں پیداوار دیکھ کر بنی ہی رعایا حیرت سے کہتی تھی کہ بھیّا جی آپ کے اوپر اللہ کا کرم

ہے، ہم لوگ اِتنی محنت کرتے ہیں مگر اِتنی پیداوار نہیں ہوتی، آپ ڈھیلوں میں بیج ڈال دیتے ہیں اور خوب پیداوار ہوتی ہے۔ غرضکہ جملہ کاموں کے سیاہ وسفید کے مالک تھے مگر اپنی ذات خاص پر کھانے پہننے کے علاوہ کبھی نیّت میں فتور نہیں پیدا ہوا، کہ آیندہ زندگی کے لئے بندوبست کرلیں۔ ورنہ اُس وقت چاہتے تو نقدی سرمایہ بھی اِس قدر ہو جاتا کہ ساری عمر آرام سے بسر کر سکتے۔ اور اپنے نام کچھ آراضی کا اندراج کاغذات پٹواری میں درج کرا لیتے یا والد صاحب جو میرے کاموں سے انتہائی خوش تھے کہکر بطور گزارہ کچھ قطعہ آراضی حاصل کر لیتے تو پاکستان آنے کے بعد وہ وہاں بھارت حکومت میں ضبط کرلی جاتی۔ اور کسٹوڈین کی نقل حاصل کرکے پاکستان میں کلیم کر سکتے تھے۔ لیکن یہ اسلامی نقطۂ نظر سے بہتر نہ تھا۔ کیونکہ اِس طرح ہم اپنے دیگر بھائی بہنوں کے حقوق پر متصرّف ہونے کے مترادف قرار پاتے جو قطعاً ناجائز تھا۔ اس کے برخلاف جو رقم مجھے نور پور شاہ کے مقدمے میں ملی تھی وہ بھی بھائی اختر حسین صاحب کو دے دی۔ کیونکہ وہ اب ملازمت سے برطرف ہو کر گھر آ چکے تھے اِسیطرح جو رقم بھی لکھنؤ میں ملازمت کے زمانے میں پس انداز کی تھی وہ اپنی اَھلیہ کی والدہ صاحبہ کو دے کر پاکستان کا سفر

گیا کیونکہ ان کی خدمت میرے سپرد تھی اور اب میں اتنی دور رہ رہا تھا کہ امید نہ تھی کہ ان کی خدمت کر سکوں گا۔ حالانکہ وہ بھی بعد کو پاکستان آگئیں اور یہیں اپنے داماد اور بیٹی کے سامنے داعی اجل کو لبیک کہا اور میرے ہاتھوں تجہیز و تکفین کے امور انجام کو پہونچے۔ بہرحال پاکستان آنے کا جو پہلا ثمرہ ملا وہ یہی تھا کہ بھارتی قانون کے بموجب ہر پاکستان جانے والا اپنے آبائی اور موروثی حقوق سے محروم کر دیا گیا اور مجھے جو وہاں پسماندگان کے لئے استثناء رکھی گئی تھی کہ زمینداری ضبط کرنے کے بعد سائر۔ سیر اور رہائشی مکان چھوڑ دیا گیا تھا اس سے بھی محروم ہو گیا اور بزرگوں کا اثاثہ جو کئی پشتوں کا سرمایہ تھا اس سے محروم ہو گیا۔ گھر کی آبائی میراث سے نہ ایک انچ زمین کا ٹکڑا ملا اور نہ ایک چھلّہ ملا۔ بہرحال یہ تو دنیاوی اشیاء تھیں جو آنی جانی ہیں۔ اگر ملتیں بھی تو دنیا ہی میں چھوڑ کر چلا جاتا۔ سب سے زیادہ ملال اس امر کا ہے کہ والدین کی خدمت جو ہر بیٹے کا دینی فریضہ ہے اس سے بھی محروم رہا۔ اور پاکستان میں چونکہ فوجی ملازمت تھی اس بناء پر والد صاحب (سید محمد حسین) اور والدہ صاحبہ امام باندی بنت سید آل حسن) کا انتقال ہوا، اور ان کے جنازوں کو کاندھا بھی نہ دے سکا اور نہ وہاں جا کر ان کی قبروں پر

ایک سورۂ فاتحہ ہی پڑھ سکا۔ گوکہ یہاں رہتے روزانہ نماز
کے بعد والدہ صاحبہ۔ والد صاحب۔ دادا صاحب،
بھائی اصغر حسین صاحب، بہنیں (سیّدہ بیگم وافتخار بانو)
اور اپنی اہلیہ مرحومین کی روحوں کو ہر ممکن ثواب ہدیہ
کردیتا ہوں۔ یہ ہے وہ پہلی اُفتاد جو پاکستان آنیکے
جُرم میں حاصل ہوئی۔ حالانکہ پاکستان کا آنا اپنی مرضی
سے تھا اور آج بھی خوش ہوں کہ اُس ماحول میں رہتا ہوں
جہاں مذہبی رسم ورواج کی پابندیوں میں آزاد ہوتے،
شاید بھارت میں رہ کر شدّھی، ہی باعث نجات ہوتی
یا بے بسی اور مجبوری کی زندگی گزارتا۔ یہاں آکر قلبی سکون
توضرور ہے۔ لیکن یہاں صرف اُن لوگوں نے فائدہ حاصل
کیا ہے جنھوں نے اپنا ضمیر بیچدیا اور جو شریف وایماندار
تھے وہ نہایت کسمپرسی کی حالت میں ہیں۔ اور انقلاب زمانہ کو
حسرت ویاس سے نظر کررہے ہیں۔ جن کے باپ دادا غلامی
کرتے تھے وہ برسرِ اقتدار ہیں۔ اور جو خاندانی شریف تھے
وہ نانِ شبینہ کو محتاج ہیں۔ الغرض میرا انعام یہ ہے کہ باپ
دادا کی میراث سے محروم ہوگیا۔ کہنے کو کہہ سکتا ہے کہ آپ پھر
بھارت سے کیوں آئے تھے۔ وہیں رُک گئے ہوتے۔ بیشک
یہ ہماری اسلامی ہمدردی تھی کہ ہمیں کفار کی غلامی پسند نہ تھی

ملک اپنے اِسلامی مُلک کی گدائی کو بہتر سمجھتے تھے۔
اَب دوسری اُفتاد دیکھئے :-

(۲) اَزدواجی زندگی کے سلسلہ میں بتا چکا ہوں کہ میرے والد نے حکم دیا تھا کہ آج سے وہ تمہارا مکان ہے اور ان لوگوں کی خدمت کرنا تمہارا فرض ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ والد صاحب کے حکم کی تعمیل آج تک پوری کر کے سُبکدوش ہوگیا ہوں۔ یعنی اُس گھر کا پُرانا ملازم مجید خاں کا کفن دفن میرے ہاتھوں ہُوا۔ اَہلیہ کی دادی صاحبہ کا کفن دفن ہُوا۔ اُن کی والدہ صاحبہ کا کفن دفن کیا اور یہ سب مجھ سے خوش ہو کر دُنیا سے گئے۔ صرف یہ غم ضرور ساتھ لیکر گئے کہ اُن کی آرزو جو تھی کہ یہ گھر آباد ہوجائے' وہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ جس کے لئے مَیں مجبور ہوں' کیونکہ اُس کی مصلحت سے بندہ مجبور ہے۔ اگر وہ چاہتا تو دُنیا کی کوئی قوت اُس گھر کی بربادی کو نہیں روک سکتی تھی۔ جب اَہلیہ کے گھر کے تمام لوگ رحلت کر چکے اور صرف تنہا وہی باقی رہ گئیں اور اگر والد صاحب کا حکم دامنگیر نہ ہوتا تو مَیں عالمِ شباب میں اَولاد کیلئے دوسری شادی کرسکتا تھا۔ مگر اِس طرح اَہلیہ کو دلی صدمہ ہوتا اور یہ امر والد صاحب کے حکم کی عدول حکمی قرار پاتا۔ بیشک کوئی کہہ سکتا ہے کہ کوئی لڑکا لے کر پال لیا ہوتا ٹھیک ہے اس کی

خواہش میں سب نے بارہا کہا لیکن تمام اعزہ جانتے ہیں کہ اہلیہ
انتہائی غوطہ طہارت کی پابند تھیں۔ ایسی حالت میں بچے کی
پرورش اور اس کا پیشاب پاخانہ کون صاف کر سکتا تھا اس لئے
مجبوری تھی غالباً نہیں بلکہ یقیناً اس میں بھی خدا کی خاص مصلحت
ہوگی کیونکہ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ ہم بظاہر ایسے
اچھا نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کہ اولاد ہوتی اور احکام خداوندی
کے لحاظ سے صحیح راہ پر گامزن نہ ہوتی تو چونکہ اولاد کی ذمہ داری
والدین پر ہوتی ہے اس لئے ان کے گناہوں میں بھی حصہ دار
ہوتے اور ان کے انتقال کے بعد بھی نامۂ اعمال سیاہ ہوتا
رہتا۔ ان چیزوں کا تعلق علم غیب سے ہے جس کا علم سوائے خدا
کے اور کسی کو نہیں یا اپنے اس بھیجے ہوئے کو بتلا دیتا ہے جس سے
وہ راضی ہو۔ بہرحال چونکہ میرا مستقل قیام سسرال میں تھا،
اور مورخہ ۳ جون ۱۹۴۵ء کو اہلیہ کی دادی صاحبہ جو اس وقت
حیات تھیں، کل جائیداد مکان، امام باڑہ وغیرہ میرے نام ہبہ
کرنا چاہتی تھیں لیکن میرے اصرار پر کہ آپ اپنی بیٹی کے نام کر دیں
انھوں نے ہبہ کر دیا اور رجسٹری کرا دی، اس طرح میں اس
گھر کی جائیداد اور مکان کا وارث قرار پایا اور اس گھر کے
جملہ اثاثہ کا مالک بھی تنہا میں تھا۔ پاکستان آتے وقت جیسا
کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ اہلیہ کی والدہ صاحبہ صرف باقی تھیں،

اس لئے میں نے کہا کہ میں ان کو چھوڑ کے جاؤں کیونکہ آپکو تکلیف
ہوگی۔ مگر اسی زمانے میں اَھلیہ کی سگی چھوٹی خالہ سلون آچکی تھیں
ن کے ہمراہ صرف ایک لڑکی عروج بیگم تھی۔ اُن کے شوہر صاحب
ضلع پرتاب گڑھ میں ہیڈ محرر پولیس تھے، جن کا نام ولایت حسین
تھا اور میں بھی انھیں چچا کہتا تھا، وہ صرف چھ ماہ بعد ریٹائر ہونے
والے تھے، اس لئے ان کی چھوٹی خالہ نے بھی کہا کہ آپ وائف
کو لئے جائیں، وہاں آپ کو تکلیف ہوگی۔ یہاں میں آگئی ہوں۔
ن کی والدہ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے پائے گی۔ اور آب
ہ (شوہر) بھی چھ مہینے بعد ریٹائر ہو کر آجائیں گے۔ اِس طرح
میں اَھلیہ کو ساتھ لیتا آیا اور ان کی والدہ، ان کی خالہ صاحبہ
کے رحم و کرم پر رہ گئیں، کیونکہ ان کو کچھ دِنوں پہلے فالج کا حملہ
ہو چکا تھا۔ علاج و مُعالجہ سے صحت یاب ضرور ہو گئیں تھیں
لیکن اب کام کاج سے مجبور تھیں۔ جب میں پاکستان آیا تو
صرف کپڑوں کا بکس اور بستر ہمراہ تھا۔ اَپنا ذاتی سامان مسہری
مز کرسی۔ فینس۔ گراموفون۔ ڈیگ۔ دیگچہ وغیرہ کچھ لے کر
س آیا۔ یہاں آنے کے کچھ دنوں بعد کلیم وغیرہ کا سلسلہ شروع
الد و الدین وغیرہ حیات تھے۔ کُل جائیداد اُن کے نام تھی،
رے نام نہ تھی۔ اِس لئے وہیں ضبط ہو گئی اور کوئی کلیم نہ
سکا۔ مکان کے لئے صرف دو جھوٹے گواہ بھی دے دیتا تو

مکان مِل جاتا لیکن اِسے بھی میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔ ہاں
صرف واقف (اہلیہ) کی طرف سے کلیم داخِل کیا جس کی
رجسٹری مورخہ ۳ جون ۱۹۵۰ء میرے پاس تھی اور چچا صاحب
(ولایت حسین) کو لکھا کہ میں نے یہاں اِن کا کلیم داخل کردیا
ہے۔ اُس میں کھیوٹ۔ کھتونی اور مکان کو نیلام کراکر کسٹوڈین
کی نقل لیتے آیئے اور انکی والدہ کو ہمراہ لیتے آئیں۔ پولیس
کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل تھے ریٹائر ہونے کے قریبی زمانے
میں رشوت لے کر کافی رقم جمع کر لی تھی۔ پھر میرے گھر کا تمام
سامان اور میرا ذاتی سامان فروخت کردیا اُس کے پیسے بھی
اپنے پاس رکھے۔ میرے خط سے اِشارہ مِل چکا تھا کھیوٹ
اور کھتونی بنوا کر ساتھ لائے۔ میں تو وہاں موجود نہ تھا
صرف وہ رہتے تھے مکان میں۔ اس لئے کسٹوڈین سے
اپنے نام پر نیلام کرا کر اُس کی نقل بھی حاصِل کی۔ اور خود
اُن کی بیوی اور ایک لڑکی مع میری اہلیہ کی والدہ، محترمہ
صفدری بیگم کے یہاں تشریف لائے اور کہا کہ میں کل کا غذ
لا رہا تھا مگر راستے سے کاغذات ہی کا بنڈل کھو گیا۔ میں نے
کہا کہ خیر یہ بھی میری قسمت ہے۔ غرض سال بھر میرے ساتھ
یہاں رہے۔ مہینے پر تنخواہ لاکر اُن کے ہاتھ میں دے دیتا تھا کہ
ایک بزرگ ہیں خرچ کریں گے۔ لیکن وہ خیال کرنے لگے کہ بچے

تو یہ کہدیا ہے کہ کاغذات کا بنڈل کھوگیا ہے۔ اگر یہاں کلیم
داخل کرتا ہوں تو راز فاش ہوگا، اِس لئے اصرار کرتے تھے کہ
میں خیرپور جاکر قیام کردوں گا۔ میں نے کہا بہتر ہے۔ ان کو
ٹکٹ لے کر بخوشی خیرپور کے لئے ٹرین پر سوار کردیا۔ وہاں
جاکر انھوں نے میرے مکمل کاغذات (جو بظاہر کھو گئے تھے)۔
ان کے پاس موجود تھے۔ کلیم کیا اور وہ منظور بھی ہوگیا۔
کھیت۔ کھیتی کے باغات اور مکان سب کچھ خیرپور میں
مل گیا۔ اور یہاں اہلیہ (والف) کا کلیم جو داخل تھا۔ صرف
رجسٹری شدہ ہبہ نامہ تھا، بقیہ کاغذات نہ تھے۔ اِسلئے
وہ خارج ہوگیا۔ یہ انقلاب زمانہ ہے کہ جو اصل مالک ہے وہ
محروم رہ گیا اور جس کے پاس وطن میں نہ رہائشی مکان تھا۔
نہ ایک درخت تھا اُس کو سب کچھ حاصل ہوگیا۔ میں نے
اہلیہ سے کہا کہ اگر تم کہو تو اِنکے خلاف درخواست دیدوں کہ
یہ سراسر فراڈ ہے۔ اِس میں یہ سزا پاجائیں گے اور کلیم بھی ضبط
ہوجائے گا۔ مگر اہلیہ نے کہا، نہیں جانے بھی دیجئے وہ اپنے
ایمان کے ذمّہ دار ہیں۔ میں خاموش ہوگیا کہ جس کی چیز ہے،
جب وہ خود ہی نہیں چاہتا تو مجھے کیا ضرورت ہے۔ ہاں یہ
بھی عرض کردوں کہ جو اُن کو بھارت میں پنشن ملی تھی، ایک
سال تک لکھا پڑھی کرکے اُسے پاکستان میں منتقل کرالیا اور وہ

سب رقم بھی ملی۔ چنانچہ سب ملاکر اس قدر اثاثہ ہوگیا کہ ایک "بس" خریدلی۔ جو وہ خیر پور سے سکھر تک چل رہی ہے۔ اب ولایت میں چچا اور اُن کی بیوی کا اِنتقال ہوگیا ہے۔ دونوں کئی کئی سال تک بستر پر پڑے ہوئے، پاخانہ پیشاب کرتے ہوئے دُنیا سے اُٹھ گئے۔ اَب صرف اُن کی لڑکی (عروج بیگم) ہے۔ اُس کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ دُو لڑکے ملازم ہوگئے۔ لڑکی کی شادی کراچی میں کردی ہے۔ اُسکے میاں علی مہدی عُرف اُلّن نے ملازمت چھوڑدی ہے اور وہی "بس" کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ عروج بیگم خود بھی ایک اِسکول میں ٹیچر ہے۔

غرضکہ خدا نے ہر طرح دُنیا میں ڈھیل دے کر بلیک مارکیٹ سے سرمایہ اِکٹھا کرنے کا موقع دیا ہے۔ وَالدین کے یہاں کی میراث کے بعد یہ دوسری حق تلفی تھی کہ سسرال کی جائیداد اور جملہ گرہستی سے محروم ہوگیا، جس کا میں تنہا وارث تھا، اور میرا سارا مال بھی لُٹ گیا۔

(۳) محترم ناظرین:- آپ نے دیکھا کہ کس طرح صعوبتیں نازل ہوئیں اور وَالدین کی میراث سے، سسرال کی میراث سے (جس کا وَاحد حق دار تھا) محروم ہوگیا اور میری زندگی کا کُل سرمایہ کس طرح لُٹ گیا، جس کا صدمہ مجھے بھی تھا اور اَہلیہ کو بھی رہا بلکہ اِس میں مزید صدمہ یہ بھی ہوا کہ دولتِ دُنیا کے ساتھ

ساتھ دولت اولاد سے بھی محروم رہا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا۔ یک جانب کاشانۂ دلِ ویران تو دوسری طرف مکان کی حلمہ آرائش نظروں میں خاک نظر آتی رہی کہ یہ کیا ہوگا اور کِس کے لئے ہوگا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ مکان کا شوق رہا، نہ سامان کا، بلکہ ایک مکان کراچی میں لالو کھیت میں لیا تھا، اور ایک ٹوٹا ہوا مکان راولپنڈی میں محلّہ وارث خان میں ملا تھا۔ انھیں بھی فروخت کر دیا۔ ایک کنال زمین مکان بنانے کو خریدی تھی جو حکومت نے ہضم کرلی۔ اب حکومت پاکستان نے جو اپنے فائنل آپٹی پر ظلم کیا اور ایسا آپٹی جس نے حکومت کی خیر خواہی میں نمایاں کام کرکے دکھلائے اُس کی داستان بھی سُن لیجیے :-

۲۳ دسمبر ۱۹۴۲ء کو R.I.A.S.C لکھنؤ میں "C" گریڈ بھرتی۔ ڈپارٹمنٹل امتحان پاس کرکے یکم جون ۱۹۴۵ء کو گریڈ "A" ہوگیا اور بحیثیت انچارج کام کرنے لگا۔ ماہ جولائی ۱۹۴۷ء کو فائنل آپشن پاکستان کے لئے دیدیا اِس طرح ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پاکستانی ہوگیا۔ ٹو اسپیشل ٹرین لکھنؤ سے چلیں ایک ۱۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کو دوسری ۱۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو۔ یہ چند مہینے جو بھارت میں قیام رہا اسی دوران بھارت نے تعصّب میں کسی کی سروس بُک بن رورش کسی میں

ڈرزشن درج کردیں، چنانچہ میری سروس بک میں بھی یکم اکتوبر ۱۹۴۳ء کو گریڈ "A" سے "B" پر رپورٹ کر کے لکھ دیا۔ غرض چکلالہ آ پانچ دِن کے سفر کی تکلیفیں اُٹھاتے ہوئے اور لڑتے بھِڑتے ہوئے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، پہنچ گیا۔ یہاں بجائے اس کے کہ ہمدردی کی جاتی اور ۱۹۴۶ء میں ہی کراچی "CMA" سے گورنمنٹ آرڈر ہو گیا تھا کہ بھارت نے جو تعصب میں اِس قسم کی اِنٹری سروس بک میں کر دی ہیں اُنکو مناسب الفاظ سے کر دیا جائے تاکہ آڈِٹ کا اِعتراض نہ ہو سکے۔ یہ درست کرنا تھا، لیکن نہیں کیا گیا، بلکہ ظلم بالائے ظلم یہ کیا کہ تمام اِسٹاف کو ایک ایک مہینے کا نوٹس دے دیا کہ تم لوگ کہیں ملازمت تلاش کر لو۔ یہاں سویلین کی ضرورت نہیں یہ تو جنگِ عظیم کے زمانے میں ایمرجنسی تھی، بھرتی کر لیا تھا۔

غرضکہ ہم لوگوں کا وفد کراچی لیاقت علی خان (وزیرِاعظم پاکستان) کے پاس گیا اور اِس ظلم کے متعلق فریاد کی۔ وہاں سے حکم آیا تمام نوٹس واپس لے لی جائیں اور اِن کو دوسرے دفتروں میں تبدیل کر دیا جائے۔ الفاظ یہ تھے :-

THESE OPTIES SHOULD NOT BE WAISTED OUT AS IT WILL BE A DEAD LOSS TO THE GOVERNMENT

AND THEY SHOULD BE ABSORBE TO SERVE THE DEPATMENTS WHERE CIVILIANS ARE AUTHORISED,

بہرحال نوٹیفیکیشن واپس لے لی گئیں۔ اور تمام دفتروں سے لسٹ مانگی گئی۔ جہاں جہاں ضرورت تھی اور ہم لوگوں نے بتلایا جس کو جہاں سہولت تھی، جانا چاہا، کوئی لاہور گیا کوئی کراچی گیا۔ سب لوور فارمیشن میں گئے اور ان کے حقوق بحال رہے۔ میں نے بدقسمتی سے یہ کہدیا کہ "GHQ" جاؤں گا۔ چنانچہ یہاں تبادلہ ہوگیا اور رپورٹ کردی یعنی "ASC" میں ۲۰ مارچ ۱۹۴۹ء کی شام تک کام کیا اور ۲۱ مارچ ۱۹۴۹ء کی صبح سے "GHQ" میں کام شروع کردیا۔ انھوں نے پہلی تنخواہ دی وہ جو نئے ملازم کو دی جاتی ہے۔ بس وہ تاریخ ہے جس سے جھگڑا شروع ہوا اور اور آج تک چل رہا ہے۔ میں نے درخواست دی کہ میں نے کوئی درخواست نہیں دی تھی کہ مجھے ملازم رکھ لیجیے، آپکے یہاں شارٹیج تھی اور ہم وہاں سرپلس تھے۔ آپ نے وہاں کے "CAO" کو لکھ کر مانگا، ہم ٹرانسفر ہوکر۔ بلا بریک کے آپکے یہاں آگئے۔ اور پھر پاکستان کے فائنل آپٹی بھی تھے۔ کس طرح

ہمارے حقوق تلف کر سکتے ہیں۔ "GHQ" کا کہنا یہ تھا کہ ھم
لوور فارمیشن کی سروس شمار نہ کریں گے۔ غرضکہ لڑتے ہوئے
"GHQ" کو ماننا پڑا۔ CPDTC AGS
BRANCH (CPIV) سے گورنمنٹ کیا گیا ھم نے
418 CSR Part "B" کے تحت تمام ملازمت
برائے تنخواہ۔ پنشن اور چھٹیوں کے شمار کر لی لیکن اپنے گورنمنٹ
لیٹر پر عمل درآمد نہیں کیا اور وہ اسی پرانی روش پر قائم
رہے۔ میں نے درخواست دی کہ مجھے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء
سے مستقل کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ماتحت آفس
"ASC" کو لکھ مستقل کرایا مگر پھر دوسرا ظلم یہ کیا کہ
جیسا یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء بھارت سے ناجائز طریقے پر رپورٹ کر دیا
تھا ویسے ہی "B" گریڈ پر مستقل کرایا جو ۱۹۶۱ء میں ہوا حالانکہ
یہ عمل بھی گورنمنٹ لیٹر جو کیبنٹ سکرٹریٹ اسٹیبلشمنٹ سے
۱۹۵۲ء میں نکلا تھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جو جس گریڈ میں
ہے اُس سے نیچے کے گریڈ میں مستقل نہیں ہو سکتا۔ اس گورنمنٹ
لیٹر کی بھی خلاف ورزی کی گئی۔ اور اس گورنمنٹ لیٹر کی بھی جو ختم
ہو چکا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں "CP IV" سے جاری ہوا۔ اور یہ
پاکستان کی اسلامی حکومت ہے کہ نہ کسی گورنمنٹ لیٹر پر عمل
کیا اور جو "B" گریڈ سے ہی ۱۹۶۱ء میں مستقل کر دیا تھا۔ جو

اگست ۱۹۴۷ء ہوا تھا اُس پر بھی عمل نہیں کیا اور اسی طرح
غیر مستقل "L.D.C" اور "U.D.C" کی تنخواہ دیتے
رہے۔ اور میں حلف سے خدا اور رسُول کو حاضر و ناظر جان کر
کہہ رہا ہوں کہ میں "L.D.C" تھا اور "ADMIN CASG
- GURUP" میں سات برس انچارج بنا کر رکھا گیا
میرے ماتحت۔ ایک مسٹر وقار حسن اور دوسرے مسٹر چیمہ
تھے۔ وہاں اُس وقت ہادی حسین صاحب سپرنٹنڈنٹ تھے۔
پھر "U.D.C" ہو گیا تھا تو چار سال "WE -- IV" میں
رم گروپ میں اسی طرح کام کیا، پھر "MT-6" میں
بحیثیت انچارج پرنٹنگ گروپ، چھ سال تک کام کیا اور
میرے ساتھ جو ٹائپ کرنے والا کلرک تھا منظور حسین وہ
آج کل "G. III" لگا ہوا ہے۔ غرض میں تو رہا غیر مستقل
"L.D.C" اور کام کرتا رہا انچارجی کا۔ اِس بات کی بھی
پورے پاکستان میں مثال نہ ملے گی کہ اگر میں براہ راست
"GHQ" میں بھرتی ہوتا تو بھی دس، بارہ سال میں
مستقل کر دیا جاتا۔ مگر میں نے اٹھائیس (۲۸) برس کی ملازمت کر کے
ریٹائرمنٹ خود لے لیا، جبکہ اُس وقت شرط یہ تھی کہ
چھتیس سال سے زیادہ کی ملازمت ہو جائے یا پچپن برس
کی عمر ہو جائے تو ریٹائر ہو جاتا۔ چونکہ اب میں مقدمہ عدالت

میں لا چکا تھا اس لئے خود ریٹائرمنٹ لے کر چلا گیا اور ریٹائر ہونے کے وقت میرا نمبر "TC - 3242" تھا جبکہ میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو "PC - 363" تھا۔ الغرض فریادیں کرتا رہا کہ مجھے گریڈ "A" مستقل کیا جائے اور سینیئرٹی کے حقوق دیئے جائیں۔ مگر نہیں دیا گویا ظلم کرنے میں خدا و رسول کا خوف بھی نہ تھا اور نہ میدانِ حشر میں سوال و جواب پر یقین تھا۔

بہرحال ۱۲ جنوری ۱۹۷۰ء کو پھر "DOPT II" کرد کہ وہ جو ۱۹۶۷ء میں "B" گریڈ مستقل کیا گیا تھا اس کو بجائے "B" کے "A" ریڈ کرو۔ اور یہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے گریڈ مستقل ہیں۔ اب بھی اس پر نہیں کیا ورنہ سات آٹھ مہینہ بعد ۱۱ اگست ۱۹۷۰ء کو ریٹائرمنٹ لیا ہے۔ اگر سینیئرٹی لگا کر آخری گریڈ دے دیا جاتا تو کم از کم میری پنشن ہی اس آخری گریڈ پر بن جاتی۔ لیکن مجھے تاحیات نقصان پہونچایا اور جو تنخواہ "U.D.C." کی دے رہے تھے اسی پر انٹی سینیئرٹی پنشن دے دی۔ مقدمہ جو میرا عدالت میں تھا اس کا فیصلہ بھی ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ہو گیا۔ اور انھوں نے تمام بقایا تنخواہ معہ ایکوا ئیرمنٹ بینی فٹ یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے دلوایا لیکن عدالت کا فیصلہ بھی بے وقعت تھا اور "GHQ"

فوجی محکمہ تھا اُس نے نہ بقایا تنخواہ دیا اور نہ پنشن فائنل کی۔ درخواستیں دیتا تھا تو جواب بھی نہ دیتے تھے۔"پاکستان زندہ باد" اسلامی حکومت زندہ باد۔" آخر میں نے محتسب کو درخواست دی انھوں نے مہربانی فرماکر مجھے جواب دیا کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ تمام فوجی محکمے اور ان کے ملحقہ دفاتر سب صدر صاحب کے اختیار میں ہیں۔ اب میں نے کئی درخواستیں صدر صاحب کو دیں۔ جنھوں نے عدل کرنا تو الگ، رہا، جواب دینا بھی پسند نہیں کیا، کیونکہ فوجی محکمہ کی شکایت تھی۔ پھر جب وزیر اعظم بنا یا تو انکو درخواست بھیجی مگر انھوں نے بھی جواب نہ دیا۔ بالآخر ۱۹۸۵ء کے آخر مہینوں میں جب اعلان ہوا کہ مارشل لاء اٹھالیا گیا تو پھر میں نے سروس ٹریبونل اسلام آباد کو درخواست دی، اور اپیل کی جس کا نمبر APPEAL No.122/K/85 ہے وکیل مسٹر انور حسین کاظمی ہے۔ اس اپیل کی سماعت ۳ دسمبر ۱۹۸۵ء کو دورہ پر کراچی میں کی۔ میرے وکیل نے کہا میں کوئی نئی چیز نہیں مانگتا، جو آپ نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو فیصلہ کیا ہے وہ مجھے آج تک نہیں ملا، وہ مجھے دلوایئے۔ لہٰذا عدالت نے اسے منظور کرلیا۔ مگر خدا معلوم مارشل لا اُٹھنے کے بعد بھی عدالت اب تک "GHQ" سے اپنے فیصلے

پر عمل نہیں کرا سکی، پچیس برس سے برابر مہلت دے رہی ہے۔
اور اس کا بھی کوئی قابو نہیں چلتا۔ یہ پاکستان عدالتوں کا حال ہے جبکہ برابر اعلان یہ ہوتا ہے کہ عدلیہ آزاد ہے۔
اب تو خدا ہی سے فریاد ہے۔ نہ یہاں عدل ہے نہ انصاف۔ نہ ظلم سے خوف ہے نہ کسی کا حق چھیننے سے ڈر۔ بے شک اسلام کا نام لیا جاتا ہے۔ اگر اسی کا نام اسلام ہے تو ایسے اسلام کو میرا سلام۔

(۴) روزانہ ٹیلیویژن پر دیکھتا اور سنتا ہوں کہ انسانی ہمدردی سب سے بڑی عبادت ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ انسانی ہمدردی کا سبق صرف غریب عوام کے لئے ہے یا اس پر عمل کرنا ان پر بھی فرض ہے جو بالادست ہیں، جن کے ہاتھوں میں طاقت ہے۔

میں خود اپنی ہی مثال پیش کرتا ہوں کہ میں نے ۱۵ر فروری ۱۹۶۶ء کو ایک قطعہ آراضی جس کا رقبہ ایک کنال ایک مرلہ ہے جو پشاور روڈ پر موضع ترنول سے آگے بائیں جانب لب سڑک ہے۔ اس وقت یہ سڑک کے بائیں طرف کا علاقہ تحصیل راولپنڈی میں تھا، بہرحال خرید کر اسی روز اس کی رجسٹری کرائی اور اپنی اہلیہ کے نام سے خریدی تھی تاکہ مکان بنا سکیں۔ چند مہینے بعد اسلام آباد نے اعلان کر دیا،

اِدھر ایک میل تک، کا علاقہ بھی راولپنڈی سے نکال کر اسلام آباد میں شامل کر لیا گیا ہے۔ خبردار نہ کوئی اِس پر تعمیر کرے اور نہ فروخت کرے۔ میں نے اپنی اَہلیہ کی جانب سے درخواست دی کہ مجھے دوسری قطعہ آراضی دے دی جاوے، لیکن نامنظور جب میری اَہلیہ کا اِنتقال ہوگیا تو چونکہ وہ لاولد تھیں میں نے مجسٹریٹ کے یہاں سے وراثت نامہ بنوا کر اُسے اپنے نام کرالیا۔ پھر میں نے دَرخواست دی مگر "C D A" میں کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ محتسب کو درخواست دی، اُن کو "C D A" نے سمجھا دیا، کہ ابھی قیمت دینے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جب ہم اِستعمال کریں گے تب قیمت دیدی جائے گی۔ ہمیں لکھ کر محتسب نے جواب دیدیا۔ اَب میں نے وزیرِ اعظم کو لکھا، انھوں نے مناسب کارروائی کا حکم دیا تو انھیں بھی لکھ دیا کہ جب اِستعمال کریں گے تو قیمت دِی جائے گی۔ اور وہ آراضی مَزروعہ ہے۔ میں نے تمام کاغذات ثبوت میں لگا کر وَزیرِ اعظم کو بھیجا کہ یہ کیا اِنصاف ہے کہ جب اِستعمال کریں گے تب قیمت دے دی جائے گی۔ بیش سال یونہی گزر گئے اور آئندہ دس سال اگر انھوں نے اِستعمال نہ کیا تو قیمت لینے والا ہی دُنیا سے چلا جائے گا۔ اگر بیش برس قبل اس کی معمولی قیمت دے دیتے تو اُسی قیمت سے میں دوسری جگہ زمین خرید کر بنوا بھی لیتا۔ اب اگر قیمت دی جائے تو نہ اُس

قیمت میں اُس کی چوتھائی زمین خرید سکتا ہوں نہ اب اِس گرانی کے زمانے میں بنوا سکتا ہوں۔ یہ کس قسم کا ایکوائر منٹ ہے کہ ہم کو تو بیدخل کر دیا ہے اور ابھی انھوں نے استعمال نہیں کیا لہٰذا قیمت بھی نہ دیں گے۔ حالانکہ قیمت کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ قیمت تو جو اس کی بیس سال تھی وہ سرکاری خزانے میں جمع رہی اور اس رقم سے دُونا گنا نفع کما چکے ہیں اور آج میرے جیسے ہزاروں آدمی ہیں جو فریاد کر رہے ہیں اور "C D A" پرواہ نہیں کرتا۔ میں نے وزیرِ اعظم صاحب کو یہ بھی لکھا تھا کہ انھوں نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے کہ وہ کاشتکاری کی زمین ہے۔ اُس پر نہ پہلے کبھی کاشت ہوئی ہے اور نہ اب ہو سکتی ہے۔ وہ کنکریلی پتھریلی زمین ہے اگر آپ حکم دیں تو میں آپ کے ہمراہ چل کر موقع کا معائنہ کرا سکتا ہوں۔ وزیرِ اعظم نے ابھی اس کا جواب نہیں دیا تھا۔ ایک ریمائنڈر بھی بھیج چکا ہوں، اور دوسرا بھیجنے کا خیال تھا کہ معلوم ہوا، وزیرِ اعظم خود اپنی کرسی سے علیٰحدہ ہو گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس سے فریاد کی جائے۔ کیا دُنیا میں ایسی مثال ملے گی۔ جس کی چیز چاہو چھین لو اور اُسے نہ قیمت دو نہ اُسے اس کے عوض دوسری زمین دو۔ اگر اسلام آباد میں آراضی وہ نہیں دے سکتے تو کیا پورے پاکستان میں ان کے پاس زمین نہیں ہے۔ میں کسی قیمت پر تیار نہیں

... کہ اس کی قیمت لوں خدا گواہ ہے کہ مکان بنانے کے لئے خریدی تھی اور حکومت کے چھین لینے کے سبب آج تک مکان نہیں بنا سکا، بے عزتی کی زندگی گزار رہا ہوں اور اپنے عزیزوں کے رحم وکرم پر پڑا ہوا ہوں۔ اِس محکمہ کا نام "آبادکاری" رکھا گیا ہے جبکہ اِس کا نام بربادکاری زیادہ موزوں تھا۔ اس محکمہ میں کام کرنے والوں کے پاس بڑی بڑی کوٹھیاں موجود ہیں اور ان بے تعلق لوگوں کو مِل رہا ہے جو یا تو بڑے اثر رسوخ کے مالک ہیں یا جا کر انکی جیبوں میں نوٹ بھر دیتے ہیں۔ خدا سے دُعا ہے کہ ان ظالموں سے نجات حاصل ہو۔ اور بارگاہِ خداوندی میں پہونچکر فریاد کروں۔ کیونکہ وہی عادلِ حقیقی ہے۔ میعاد گزرنے کا بھی خوف نہیں ہے چند دنوں تو دیکھ رہا ہوں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ شاید کوئی اللہ کا بندہ مُنصف مزاج آجائے اور مظلوموں کی فریاد سُن لے۔

(۵) مَیں عرض کر چکا ہوں کہ میرے والدین اپنے آبائی مکان میں چونکہ بھارت میں تھے اس لئے مَیں نے مکان کا کلیم نہیں کیا اور یہ بھی بتلا چکا ہوں کہ اہلیہ کی طرف سے کلیم داخل کیا تھا مگر کس طرح لٹ گیا اور واتِف کا کلیم خارج ہو گیا۔ اب عرض یہ کرنا ہے کہ پاکستان کے قانون سے اگر کوئی شخص کسی مکان میں دس سال رہ چکا ہے تو وہ مکان بطور نان کلیمنٹ ملجاتا

ہے۔ میں بھابڑ خانہ میں گلی گنگا رام میں مکان نمبر D./270 میں رہتا تھا۔ یہ مکان تین منزلہ تھا۔ درمیان کی منزل میں ظفر عباس صاحب رہتے تھے اور "CCMA" میں ملازم تھے، انھیں کے نام پورا مکان ڈوفر کی طرف سے الاٹ تھا۔ نیچے کی منزل میرے پاس تھی اور اوپر کی منزل مسٹر ہاشم کے پاس تھی یہ انکم ٹیکس میں سپروائزر تھے۔ جب ظفر عباس صاحب یہاں سے تبدیل ہوکر "واہ فیکٹری" چلے گئے اور وہاں فیملی کوارٹر لے لیا۔ تو مسٹر ہاشم نے بیچ کے حصّے میں بھی قبضہ کرلیا اور نیچے کے حصّے کی طرف بھی نظریں جمائے رہے۔ چنانچہ ڈیوڑھی میں غسل خانہ و پاخانہ تھا اور چار زینہ بنا کر ان دونوں کی چھتوں پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اُس میں ایک بیوہ سیدانی جو مسٹر ہاشم ہی کی ہموطن تھی وہ اپنے ایک دس، گیارہ سال کے یتیم بچّے اصغر کو لے کر رہتی تھی اور محلّے والوں کے یہاں سے کچھ امداد ہوجاتی تھی اس پر گزر بسر کرتی تھی اور اپنے یتیم بچّے اصغر کو پالتی تھی۔ چونکہ ہاشم کی نیت ٹھیک نہ تھی۔ اوپر کے حصّے میں رہتے تھے۔ پھر ظفر عباس کے جانے کے بعد بیچ کے حصّے پر قبضہ کرلیا تھا۔ ایک دن اُس بیوہ سے بہت ناراض ہوئے اور اُسکا سامان اُٹھا کر پھینک دیا۔ وہ غریب روتی پیٹتی چلی گئی۔ لوگوں سے مانگ جانچ کر اتنا کرلیا کہ بچّے کو لے کر کراچی چلی گئی اور ڈرگ کالونی

میں ایک جگہ جھونپڑی ڈال کر رہنے لگی۔ مجھے اب نہیں معلوم کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اب انھوں نے دوسری چال چلنی شروع کی یعنی میں تو چونکہ نان کلیمنٹ تھا اس لئے وہی فارم داخل کیا۔ اور مسٹر ہاشم دراں حالیکہ کلیمنٹ نہ تھے۔ لیکن فراڈ کرکے کلیمنٹ کا فارم خاموشی سے داخل کیا اور آہستہ آہستہ کوشش کرکے الاٹمنٹ کرالیا۔ جب پورے مکان کا الاٹمنٹ ہوگیا تو مجھے نوٹس دی کہ مکان میرے نام ہوگیا ہے لہٰذا آپ کرایہ دیں یا مکان خالی کر دیں۔ میں نے دعویٰ کر دیا کہ مسٹر ہاشم نے گورنمنٹ کے ساتھ اور میرے ساتھ فراڈ کیا ہے کیونکہ وہ کلیمنٹ نہ تھے اور غلط فارم داخل کیا ہے۔ اور دوسرے شخص کی کلیم کی کتاب خرید کر قیمت ادا کر دی ہے۔ لہٰذا یہ نامنظور کیا جائے۔ اور چونکہ میں بتیس سال سے اسی مکان میں رہتا ہوں اس لئے میرے نام الاٹ کیا جائے۔ اوّل تو مسٹر ہاشم کلیمنٹ نہیں ہیں۔ اور بالفرض مان لیا جائے تو کلیمنٹ وہ مکان لے سکتا ہے جس میں رہتا ہو یا شہر میں دوسرا مکان لے لے۔ لیکن نان کلیمنٹ دوسرا مکان نہیں لے سکتا اس لئے میرا حق کدھر گیا۔ مگر چونکہ وہ انکم ٹیکس میں ممبر یا منسٹر تھے اس لئے اُن کا اثر و رسوخ تھا یہاں کی عدالتوں نے انھیں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ہائی کورٹ کیس لے جاؤں گا۔ مگر اتفاق یہ ہوا کہ مسٹر ہاشم

ہے۔ میں بھابڑ خانہ میں گلی گنگا رام میں مکان نمبر D/270 میں رہتا تھا۔ یہ مکان تین منزلہ تھا۔ درمیان کی منزل میں ظفر عباس صاحب رہتے تھے اور " CCMA " میں ملازم تھے۔ انھیں کے نام پورا مکان دفتر کی طرف سے الاٹ تھا۔ نیچے کی منزل میرے پاس تھی اور اوپر کی منزل مسٹر ہاشم کے پاس تھی یہ انکم ٹیکس میں سپروائزر تھے۔ جب ظفر عباس صاحب یہاں سے تبدیل ہو کر " واہ فیکٹری " چلے گئے اور وہاں فیملی کواٹر لے لیا۔ تو مسٹر ہاشم نے بیچ کے حصے میں بھی قبضہ کر لیا اور نیچے کے حصے کی طرف بھی نظریں جمائے رہے۔ چنانچہ ڈیوڑھی میں غسل خانہ و پاخانہ تھا اور چار زینہ بنا کر ان دونوں کی چھتوں پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اس میں ایک بیوہ سیدانی جو مسٹر ہاشم ہی کی ہموطن تھی وہ اپنے ایک دس گیارہ سال کے یتیم بچے اصغر کو لے کر رہتی تھی اور محلے والوں کے یہاں سے کچھ امداد ہو جاتی تھی اس پر گزر بسر کرتی تھی اور اپنے یتیم بچے اصغر کو پالتی تھی۔ چونکہ ہاشم کی نیت ٹھیک نہ تھی۔ اوپر کے حصے میں بنے تھے۔ پھر ظفر عباس کے جانے کے بعد بیچ کے حصے پر قبضہ ... لیا تھا۔ ایک دن اس بیوہ سے بہت ناراض ہوئے اور اسکا ... نکال کر پھینک دیا۔ وہ غریب روتی پیٹتی چلی گئی۔ لوگوں سے ... اتنا کر لیا کہ بچے کو لے کر کراچی چلی گئی اور ڈرگ کالونی

ہیں ایک جگہ جھونپڑی ڈال کر رہنے لگی۔ مجھے اب نہیں معلوم کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اب انھوں نے دوسری چال چلنی شروع کی یعنی میں تو چونکہ نان کلیمنٹ تھا اس لئے وہی فارم داخل کیا۔ اور مسٹر ہاشم درآں حالیکہ کلیمنٹ نہ تھے۔ لیکن فراڈ کر کے کلیمنٹ کا فارم خاموشی سے داخل کیا اور آہستہ آہستہ کوشش کر کے الاٹمنٹ کرالیا۔ جب پورے مکان کا الاٹمنٹ ہوگیا تو مجھے نوٹس دی کہ مکان میرے نام ہوگیا ہے لہٰذا آپ کرایہ دیں یا مکان خالی کر دیں۔ میں نے دعویٰ کر دیا کہ مسٹر ہاشم نے گورنمنٹ کے ساتھ اور میرے ساتھ فراڈ کیا ہے کیونکہ وہ کلیمنٹ نہ تھے اور غلط فارم داخل کیا ہے۔ اور دوسرے شخص کی کلیم کی کتاب خرید کر قیمت ادا کر دی ہے۔ لہٰذا یہ نامنظور کیا جائے۔ اور چونکہ میں بتیس سال سے اسی مکان میں رہتا ہوں اس لئے میرے نام الاٹ کیا جائے۔ اوّل تو مسٹر ہاشم کلیمنٹ نہیں ہیں۔ اور بالفرض مان لیا جائے تو کلیمنٹ وہ مکان لے سکتا ہے جس میں رہتا ہو یا شہر میں دوسرا مکان لے لے۔ لیکن نان کلیمنٹ دوسرا مکان نہیں لے سکتا اس لئے میرا حق کدھر گیا۔ مگر چونکہ وہ انکم ٹیکس میں سپرو ائزر تھے اس لئے ان کا اثر و رسوخ تھا یہاں کی عدالتوں نے انھیں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ہائی کورٹ کمیشن لے جاؤں گا۔ مگر اتفاق یہ ہوا کہ مسٹر ہاشم

نہایت تندرست آدمی تھے مگر ایک دن انکا "ہارٹ فیل" ہوگیا اور انتقال کر گئے۔ پیچھے صرف ایک لڑکی اور ایک لڑکا چھوڑا۔ پس اب میں نے ارادہ کر لیا کہ یتیم بچوں اور بیوہ سے مقدمہ نہیں لڑوں گا۔ میں نے مکان خالی کر دیا اور سٹلائٹ ٹاؤن 635/D میں اپنی بہن کے مکان میں چلا آیا۔ کافی عرصہ تک یہاں رہا پھر کراچی چلا گیا۔ کچھ کرسیاں اور بنچیں یہاں لوگوں کو دے دیں اور ایک ٹرک سامان کراچی لے گیا۔ جہاں قریب قریب دو تین سال رہا ہوں گا کہ اہلیہ نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اور چونکہ وہ لاولد تھیں اس لئے تنہا میں رہ گیا۔ اب تمام انکا سامان بیواؤں کو اور یتیم خانہ میں دے دیا۔ تاکہ مرحومہ کو ثواب ہو اور چند چیزیں مثلاً چارپائیاں، میز کرسی، سائیکل وغیرہ فروخت کر دیں۔ چھ مہینے اپنے چھوٹے بھائی اطہر حسین کے ساتھ رہ کر منظر حسین کاظمی جو سب سے چھوٹے چچازاد بھائی ہیں ان کے ساتھ چلا گیا اور راولپنڈی سے سامان ٹرک پر گیا تھا۔ لیکن جب کورنگی سے رضویہ سوسائٹی سامان جانے لگا تو شوزوکی سے گیا اور کچھ ضروری سامان جو بھائیوں نے پسند کیا وہ انھیں دے دیا۔

صرف اپنی ضرورت کا سامان میرے پاس رہ گیا جو میرے بعد بھائیوں ہی کا ہے۔ تمام بنک کا اکاؤنٹ اور خاص ڈپازٹ فارم وغیرہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی منظر حسین کاظمی کے نام اندراج

بھی کرا دیا ہے تاکہ میرے بعد اُنکو مل جائے۔

صبر:- دراصل صبر کی منزل بہت بلند ہے اور اس کے درجات بھی ہیں۔ اِنسانی حدود میں رہتے ہوئے اپنے خلاف مزاج خواہشات نفسانی پر قابو رکھنا اور اعضاء و جوارح کو تجاوز نہ کرنے دینا ہی صبر ہے۔ اور پھر اس سے بلند درجہ وہ ہے کہ انسان خدا کے قضا و قدر پر راضی رہے اور زبان پر حرفِ شکایت نہ آنے پائے یہ وہ منازل ہیں کہ جس کا دعویٰ تو محال ہے لیکن انسانی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے کم از کم باوجود اختیار کے اِنتقام کا اِرادہ نہ کرنا ہی صبر کی ایک بلند منزل ہے۔ میں نے ابھی وہ واقعات پیش کئے ہیں جن کے ذریعے میرے اوپر سخت مظالم ہوئے مگر آج تک کوئی مثال نہیں ملتی کہ میں نے اِنتقام کی کوشش کی ہو۔

(۱) مثلاً پہلا واقعہ جس میں میں آبائی ترکہ سے محروم ہو گیا۔ ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) بیگھ خود کاشت تھی جو چھوٹ گئی اُس میں کا نصف جو نسٹھ بیگھ چچا کے حصّے کا ان کے لڑکے نے یعنی مشتاق حسین، نے فروخت کر دیا۔ باقی جو نسٹھ بیگھ والد کے حصّے کے بھائی صاحب کے پاس ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ صرف ایک درخواست بھارت گورنمنٹ کو بھیج دیتا کہ میں یہاں زندہ موجود رہوں میرے حصّے کی اراضی بحق سرکار ضبط کر لی جائے تو

چار بھائیوں میں سولہ، سولہ بیگھہ حصّے میں آتی تھی۔ میں اور اطہر حسین پاکستان میں ہیں اس طرح بتّیس بیگھہ ضبط ہوجاتی اور صرف وہ بتّیس بیگھہ بچتے جو بھائی صاحب اور اصغر بھائی کا حصّہ ہے۔

(۲) دوسرا واقعہ جو سُسرال کے کاغذات کھیوٹ کھتونی اور کسٹوڈین کی نقلِ مکان کے متعلق دِکھلا کر چچا ولایت حسین نے کلیم میں سب کچھ خیرپور میں لے لیا۔ ان کے خلاف درخواست دے دیتا تو اگر مجھے نہ ملتا تو وہ بھی نہ پاتے۔ یا فراڈ کے سلسلے میں سزا ہوجاتی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا یعنی دونوں حالات میں جبکہ ہم سب کچھ کر سکتے تھے اور نہ کیا، تو کیا صبر نہیں ہے؟ اسے صرف مجبوری تصور کیا جائے گا۔

اب تیسرے، چوتھے اور پانچویں واقعات میں کچھ تو انتقام لیا جاسکتا تھا۔ مگر ایسا نہ کیا یقیناً اِس کا صِلہ قدرت سے ملیگا۔

"خاندانی و غیر خاندانی تعلقات"

جہاں تک بھائی بہنوں کا سِلسلہ ہے اُس میں مجھ سے دو بڑے بھائی بھارت میں والدین کے ساتھ رہ گئے اور زمینداری بحقِ سرکار ضبط ہوجانے کے بعد جو سائر و سپر اور مکان چھوٹ گیا تھا اس کے لئے ان بھائیوں میں اختلاف رہا۔ کبھی اختر بھائی نے،

اصغر بھائی کی شکایت لکھ دیتے اور کبھی اصغر بھائی اپنے خط میں اختر بھائی کی شکایت لکھ دیتے تھے میں یہی جواب دیتا تھا کہ میرے لیے آپ دونوں بزرگ ہیں اور باپ کی منزل میں ہیں۔ اِسلیئے اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ ہمارے تعلّقات دونوں بھائیوں سے بہتر رہے۔ اصغر بھائی جب تک زندہ رہے مجھ سے خوش تھے۔ اختر بھائی بھی مجھے بہت چاہتے تھے اور کہتے کہ بھارت آؤ مگر ہر بار کہہ دیتا کہ بھائی صاحب نہ اب وَالدین زندہ ہیں اور نہ محلّہ میں بزرگ ہستیاں باقی ہیں اور جس شان و شوکت سے میں وہاں رہا اب وہاں آکر اپنی بے عزتی دیکھنا گوارہ نہ ہوگا۔ بلکہ اپنے آبائی مکان اور سسرالی گھر کی تباہی دیکھ کر بیحد رنج ہوگا۔ اِس لئے جہاں سے اپنی عزّت جاتی رہے وہاں نہ جانا ہی بہتر ہے اور رسُولپن کے اہلِ محلّہ بھی کبھی ذاکری کا ذِکر کرتے ہیں کبھی دیگر باتوں کا۔ رعایا میں جو بوڑھے موجود ہیں ان کو میرا زمانہ یاد ہے کہ کس طرح رعایا اور مالک میں بیٹے اور باپ جیسے تعلّقات تھے مجال نہ تھی کہ کوئی پولیس والا آکر میری رعایا کو ستائے اور اگر کبھی رعایا کی تکلیف سنتا تھا تو تڑپ جاتا تھا اور کوشش ہوتی تھی کہ اس کی تکلیف رفع کر دی جائے۔

اَب ذرا پاکستان آجائیے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں،

اور فخر محسوس کرتا ہوں کہ آج تک کسی بھائی بہن نے مجھ سے شکایت
نہیں کی بلکہ سیتک کا بہن اور رضی لشاد میاں جو میرے بہنوئی
تھے میری تنہائی کے سبب برابر کہتے تھے کہ آپ ناظر کو لے لیں
مگر افسوس کہ میں اس وقت یہ کہکر ٹال دیتا کہ واہ جو اچھے
اچھے لڑکے ہیں وہ آپ کے اور جو پڑھنے لکھنے سے بھاگتا ہے
وہ مجھے دیے رہے ہیں' یوں بات ٹلتی رہی۔ اب بہن حیات
لیکن ان کے بچوں سے اُسی طرح مل رہا ہوں جس طرح اُن سے کی
زندگی میں ملتا تھا۔ حالانکہ میرے دوسرے بھائی جو بھارت میں
تھے یا ہیں اور یہاں جواظہر میاں (چھوٹے بھائی) موجود ہیں۔
ان لوگوں نے کبھی کوئی سروکار ہی نہیں رکھا جس سے مجھے خیال
ہوتا کہ میری موجودگی کے بعد سب بچے ناناہال (ننہیال) کو
بھول جائیں گے۔ یہ صرف میری زندگی تک ہے۔ جس طرح
بھارت میں غیروں سے بہتر تعلقات تھے ویسے ہی آج بہت
دوست احباب میرے' یہاں موجود ہیں جو مجھے اپنے سگے
بھائی کی طرح مانتے ہیں اور ان کے گھروں میں کوئی لڑکی' بہو
وغیرہ مجھ سے پردہ نہیں کرتیں۔ یہاں بھائی شفیع اور شریف
وغیرہ سات بھائی ہیں اور ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ ہم آٹھ بھائی ہے
ہیں۔ ان کا کاروبار لاکھوں روپے کا ہے۔ حاجی اینڈ سنز
کی چار دوسری دکانیں منڈی میں موجود ہیں اور ایک دکان کراکری کی

بہت بڑی خواجہ بازار میں ہے۔ غرض یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جیسے کسی کو اختلاف کا موقع نہیں ملا۔ انتہا یہ ہے کہ مکان کا مقدمہ مسٹر ہاشم سے چل رہا تھا لیکن تعلقات میں فرق نہیں، "تاریخ مقدمہ میں بھی ساتھ" اسٹال پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ عدالت میں وہ اپنا بیان دیتے تھے، میں اپنا بیان دیتا تھا۔ گھر پر مجالس وغیرہ میں برابر آنا جانا۔ بیٹھنا اٹھنا ساتھ تھا۔ لوگ تعجب کرتے تھے کہ اچھی لڑائی ہے۔ ساتھ ساتھ ہنستے بولتے ہیں، اور عدالت میں ایک دوسرے کے خلاف بیان دیتے ہیں۔

"رفیقۂ حیات کا انتقال"

نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حالاتِ زندگی لکھوں اور شریکِ حیات کا ذکر نہ کروں۔ ان کے حالاتِ زندگی تو کسیقدر بیان ہو چکے ہیں صرف انتقال کے بعد کے چند ضروری حالات یہاں بیان کروں گا۔

جمعہ کا مبارک دن تھا۔ طبیعت تو کچھ عرصے سے زیادہ خراب رہتی تھی۔ صبح ۹ بجے میں نے دودھ گرم کرکے ایک پیالہ میں نورس ڈال کر اور چینی ملا انھیں دیا کہ کھالیں، چائے تو وہ پیتی نہ تھیں۔ میں نے بھی ناشتہ کرکے چائے پی۔ اور ۹½ بجے ان سے کہا کہ میں یعقوب صاحب کی لڑکیوں سے اور

عالمِ آن سے کہہ رہا ہے وہ سب تمہارے پاس رہیں گے۔ میں ایک ضرورت سے شہر جارہا ہوں۔ گھنٹہ دو گھنٹے میں آجاؤنگا یہ کہکر میں چلا گیا۔ مِلّن ماموں کے یہاں میں نے ذِکر کیا کہ آج کل کئی دِنوں ان (بیوی) کی طبیعت زیادہ خراب رہتی ہے اور انھوں نے اکثر یہ کہا ہے کہ مجھے جنّت البقیع قبرستان میں دفن کرنا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہاں قبر کی جگہ مل جائے آجکل ببّن میاں اور اُن کی بیوی حج پر گئے ہیں۔ کیا کیا جائے۔ مِلّن ماموں نے کہا چلیئے چل کر ظہیر صاحب سے کہتے ہیں اُن کے تعلقات ہیں میسّب صاحب سے وہ بندوبست کردیں گے۔ ہم لوگوں نے جاکر ظہیر صاحب سے کہا انھوں نے وعدہ کرلیا۔ اب ہم لوگ واپس آئے تو مِلّن ماموں اپنے گھر کیطرف چلے گئے اور میں نے کہا کہ میں پانچ منٹ کے لئے مشتاق حسین کے یہاں بھی بتلا دوں کہ اہلیہ کی طبیعت اِن دِنوں کچھ زیادہ خراب ہے۔ شاید دیکھنے جائیں۔ اور ان سے کہکر میں فوراً گھر چلا جاؤں گا۔ میں اِدھر آیا، ہلال موجود تھے۔ نغمہ چائے لے کر آئی۔ ابھی چائے پی نہ تھی کہ مِلّن ماموں آگئے اور کہا میں جیسے ہی گھر پہونچا، میری بیوی نے بتلایا کہ اطہر ماموں کا "فون" آیا تھا، صغیر بانو کا اِنتقال ہوگیا ہے۔ بس یہ سنتے ہی ہلال اُٹھے گاڑی پر بیٹھے۔ میں اور مِلّن ماموں

بھی بیٹھ گئے۔ فوراً گاڑی لے کر ظہیر کے گھر پہونچے اور انسے کہا کہ "فون" آگیا ہے، ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ فوراً ظہیر بھی گاڑی پر بیٹھ گئے اور سیدھے مُسَیّب صاحب کے یہاں پہونچے۔ راستے میں ہلال نے پوچھا کچھ روپئے ہیں، میں نے کہا، میری جیب میں پانچسو روپے ہیں۔ کوئی تین سو روپئے ان کے پاس تھے انھوں نے دیدیا۔ اب مسیّب صاحب کے یہاں پہونچکر کہا کہ "قبر" چاہئے۔ انھوں نے کوئی عذر نہیں کیا اور کہا، چھ سو پچاس روپئے لائیے، میں نے فوراً دے دیئے۔ انھوں نے قبر کا انتظام کر دیا۔ اب رضویہ امامباڑہ پہونچکر کہا کہ ہم ابھی لاش لاتے ہیں غسّالہ اور کفن وغیرہ سب تیار رکھو۔ پھر وہاں سے لاش لانے کے لئے گاڑی کو کہا وہ محلّہ انجولی میں لگی ہوئی تھی، نو۔ دس بجے رات تک فارغ نہیں ہوسکی تو لالوکھیت پہونچے اور وہاں سے "پک اپ" لیا تین سو روپئے یہاں بھی ہلال نے دے دیئے۔ اور گاڑی لیکر کورنگی پہونچے۔ یہاں دیکھا کہ تمام محلّہ کی عورتیں بیٹھی قرآن خوانی کر رہی ہیں۔ عورتوں نے بتلایا کہ "میّت" کے چہرے پر اس قدر رونق ہے کہ آج تک مرنیوالے کے چہرے پر ایسی رونق نہیں دیکھی، میں نے چادر ہٹا کر دیکھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنکھ بند کر کے سو رہی ہیں۔ ان لوگوں نے یہی بتلایا کہ مرنے سے

کچھ دیر پہلے بکس سے سفید چادر نکال کر چارپائی کے پاس
چوکی پر رکھ دی تھی تاکہ بعد میں وہ اُڑھا دی جائے۔
میں نے بکس کھول کر کربلا کا کفن نکالا تو دیکھا کہ
کفن کے پاس ایک تھیلی رکھی ہے۔ اُسے کھولا تو اس میں
نوسو روپے کے علاوہ سونے کی چوڑی اور ایک انگوٹھی بھی
تھی۔ یہ سب دیکھ کر مجھے تابِ ضبط نہ رہی اور چیخ کر رو دیا۔
بہر حال اب اُسی گاڑی میں تمام محلہ کی عورتیں اور
مرد افراد بیٹھ گئے اور لاش رکھ لی گئی۔ رضویہ اما مباڑہ پہنچے،
یہاں کچھ تیار تھا۔ حسنین ماموں نے تمام جگہ (نیو کراچی،
ڈرگ کالونی وغیرہ) "فون" کر دیا تھا۔ وہاں دیکھا تو بڑا مجمع
تھا۔ یہاں راولپنڈی سے مسٹر احسن کی بیوی (بٹو) بھی کراچی
گئی ہوئی تھیں انھوں نے ڈرگ کالونی میں سن لیا اور فوراً
رضویہ امام باڑہ پہنچ گئیں۔
دن میں ایک بجے انتقال ہوا تھا۔ غسل و کفن کے بعد
مغرب سے قبل امام باڑہ رضویہ میں نمازِ جنازہ ہوئی اور
میت بس پر رکھ کر سب مرد چلے گئے۔ عورتیں اپنے اپنے گھر
چلی گئیں۔ ۹ ½ بجے رات کو دفن کر کے رضویہ امام باڑہ واپس
آئے اور وہاں سے دوسری بس سے کورنگی اپنے گھر چلے گئے۔
اطہر کو روپے دیدیئے تھے کہ وہ غسالہ اور کفن وغیرہ

کی ادائیگی کر دیں۔ واپسی میں اُن سے کہدیا کہ جتنے افراد کورنگی چل رہے ہیں اُن سب کے ٹکٹ تم لے لینا۔ تقریباً ۱۱ بجے رات کو کورنگی گھر پہونچے۔ سیوم وغیرہ کا انتظام بھی سب اطہر کو کرنے تھے میں تو روپیہ دے دیتا تھا۔ ۳ ربقرعید کو انتقال ہوا۔ مجن میاں کو ذریعہ ڈاک مکہ اطلاع کر دی۔ انھوں نے وہاں حج کے بعد اپنے مرحوم والدین کے لئے "عمرہ" کیا تو اپنی بھابھی (مرحومہ) کیلئے بھی عمرہ کر لیا۔ اس طرح انکی حج کی آرزو بھی پوری ہو گئی اور انکی طرف سے عمرہ ان کے چالیسویں سے قبل ہو گیا۔ اور مجن کا خط اطہر کے پاس آیا کہ 'انور بھائی کو سنبھالنا' میں آکر انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

آخری لمحات عزیزوں کی توجہ اور عدم توجہ

تمام اعزّہ نے بڑی ہمدردی کے ساتھ ہر موقع پہ آکر شرکت کرنا جاری رکھا اور ہر طرح سے میرا بھی خیال کرتے رہے افتخار سلمہ کے یہاں ہاشم اور اُن کی دوسری بیوی برابر کورنگی پہونچتے رہے۔ بلکہ اُن کا ایک جملہ مجھے یاد رہے گا کہ ہاشم نے کہا کہ آپ نے جس طرح زندگی بسر کی اور اُن (اہلیہ) کا ہر طرح خیال رکھا اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ

آپ نے جہادِ نفس کیا جس کا صِلہ پروردگارِ عالم آپکو عطا فرمائے گا۔ غرضکہ ہر شخص نے بڑا خیال رکھا۔ بجز عروج سلطانہ کے جو اہلیہ کی سگی خالہ زاد بہن ہیں۔ اور خیرپور میں ہیں۔ جن کا ذکر شہر آلی میراث کے تلف ہونے کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ ان کو میں نے انتقال کا خط لکھا، تو دنیا کا اُصول ہے کہ لوگ دشمن سے بھی ہمدردی کے چند الفاظ کہہ دیتے ہیں۔ مگر اس خط کے جواب میں جو خط اُن کا آیا، وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ جواب میں نے نہیں دیا ورنہ سخت جواب ہوتا۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ آپ نے پہلے سے نہ لکھا کیا سمجھتے تھے کہ جو روپیہ پیسہ ان کے پاس ہے وہ لے لوں گی۔ آپ نے اُنھیں تکلیف دی وغیرہ وغیرہ۔ میں اُس کی تفصیل نہیں دینا چاہتا۔ وہ چالیسویں میں خیر جگہ آئیں اور میرے یہاں آکر فاتحہ میں شرکت کرکے فوراً واپس چلی گئیں۔ میں نے بھی ملنا جلنا ترک کر دیا، حالانکہ ان کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے انتقال پر میں اور میری اہلیہ دونوں گئے تھے۔ جب مجّن میاں سے ملاقات ہوئی تو عروج نے کہا کیا وہ بیمار تھیں؟ مجّن میاں نے غالباً یہ جواب دیا کہ اُنھیں صرف یہ بیماری تھی کہ اُن ہی کے عزیزوں نے اُنھیں کچھ نہ سمجھا۔ بہرحال اُن کے خط کا جواب نہیں دیا لیکن سرگذشت میں مکمل جواب خوب بجوز

آگیا، عمداً نہیں بلکہ مجبوراً لکھنا پڑا۔

آخری تمنّا دُنیا میں ہر شخص کو آرزو ہوتی ہے کہ آخر وقت کچھ وصیت کر دیتا ہے۔ کچھ اپنی تمنائیں بیان کر دیتا ہے۔ اگر یہ نہیں تو یقیناً ایک دوسرے سے مُعافی مانگ لی جاتی ہے کہ ہم نے فرائض کی ادائیگی میں جو کمی کی ہو کیسے برائے خدا معاف کر دو تاکہ اس کا مواخذہ بروزِ قیامت باقی نہ رہے۔ چونکہ وقتِ انتقال مَیں موجود نہ تھا اِس لئے یہ حسرتے باقی رہ گئی کہ کاش اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگ لیتا۔ حقِ مہر وغیرہ کے متعلق مُعافی نامہ ہو جاتا۔ غرض میری دِلی حسرتیں بھی دِل ہی میں رہ گئیں اور خدا جانے وہ کیا کہنا چاہتی رہی ہوں۔ جبکہ کوئی تنہائی میں نظر بھی نہ آتا تھا۔ بہر حال وہ خوش قسمت تھیں کہ میرے ہاتھوں دُنیا سے چلی گئیں۔ ورنہ میرے بعد خدا جانے اُنکو کِن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ مگر مجھے تنہا چھوڑ گئیں۔ اگر ایک لڑکی بھی ہوتی تو گھر بنا رہتا۔ ہاں کم از کم اُن کے لئے ہر نماز کے بعد کچھ ثواب ھدیہ کر دیتا ہوں۔ لیکن اپنے لئے مایوس ہوں کہ دُنیا داری کے طور پر سال بھر تو فاتحہ دُرُود ہو جائے گا مگر اُس کے بعد کوئی ایک سورۂ فاتحہ پڑھنے والا نہیں ہے۔ شاید کچھ دِنوں کے بعد کوئی نام بھی نہ لے گا۔

میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ "حدیث خوانی"

کے نوٹس ہیں۔ جو اگر کوئی اپنا بچہ ہوتا تو اُسے اپنے سامنے ذاکری
کے لئے تیار کر دیتا۔ مجھے بھی کچھ ثواب ملتا رہتا۔ اب تو یہ تمام
نوٹس مجموعہ، منتظر سلسلہ کے لئے ہیں یہ حدیث حاشیہ جات وہ بے
بس۔ اور چیزیں نیز روپیہ پیسہ بھائیوں کے لئے ہے۔ اگر جی
چاہے تو سبھی کارِ خیر میں خرچ کر دیں یا حالات و وقت جس بات
کے مقتضی ہوں ویسا عمل میں لایا جائے۔

"والسّلام"

التماس ایک سورۂ فاتحہ

احقر العباد:۔ سید انور حسین

تحریر نمود سید محمد حسن عسکری زیدی خادم آثار ایرانی

الحاج پروفیسر ڈاکٹر سید منظر حسین کاظمی کی کتابیں

قیمت	نام کتاب	نمبر شمار
۱۰ روپے	"روحِ لیاقت" ۔ لیاقت علیخان مرحوم پر پہلی کتاب ۔	۱۔
۱۲۵ "	واجد علیشاہ اختر کی شاعری اور مرثیے ۔	۲۔
۵۰ "	"مقاماتِ مقدسہ" (ایوارڈ یافتہ) حج و زیارات کی مکمل کتاب)	۳۔
(برائے دعائے مغفرت)	"تحسین مر نہیں سکتا، تحسین زندہ ہے!" (فرزند کی یاد میں ۔)	۴۔
۳۵ روپے	میر انیس کا غیر مطبوعہ مرثیہ ۔	۵۔

(زیرِ طبع کتب)

۱۔ میر انیس کے کلام میں رشتے داریاں ۔

۲۔ اُردو ڈرامے ۔ (جو کئی بار طبع ہو چکے ہیں)

۳۔ "اور میں پاکستان آگیا" ہندوستان اور پاکستان کا آنکھوں دیکھا حال ۔

۴۔ مضامینِ منظر ۔

ملنے کے پتے: الف/۶۲ رضویہ سوسائٹی کراچی۔ محفوظ بک ایجنسی مارٹن روڈ کراچی۔
احمد بک ڈپو رضویہ سوسائٹی کراچی۔ شیخ شوکت اینڈ سنز جناح روڈ کراچی۔